امّتِ مسلمہ کے لیے

سہ نکاتی لائحہ عمل

اور

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

امّتِ مسلمہ کے لیے

سہ نکاتی لائحہ عمل

اور

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیّت

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مع

مجدّدِ تبلیغ مولانا محمدؒ الیاسؒ کے افکار پر مبنی مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی تحریر

اور امیر تبلیغ مولانا محمدؐ یوسفؒ کی ایک تحریر

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۷۰۰ فون : ۳-۵۸۶۹۵۰۱

انتساب

امّتِ مسلمہ کے ان باہمّت

افراد

کے نام جو

قرآن حکیم

کو واقعۃً اپنا امام اور رہنما بنانے

کا فیصلہ کرلیں!

محبّت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر نظر تالیف اصلاً محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دو اہم تقاریر پر مشتمل ہے۔ زمانی اعتبار سے اگرچہ دونوں تقاریر کے مابین قریباً ۵ سال کا فصل ہے لیکن مضمون کے اعتبار سے دونوں باہم انتہائی مربوط ہیں۔ پہلی تقریر ۱۹۸۵ء کے اوائل میں کراچی کے ایک اجتماع عام میں 'اُمّتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل' کے موضوع پر ہوئی تھی جس میں محترم ڈاکٹر صاحب نے سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کے حوالے سے مذکورہ بالا موضوع پر مفصل روشنی ڈالی تھی۔ موضوع چونکہ بہت اہم تھا اور خطاب بھی نہایت موثر اور جامع' لہٰذا ہمارے بزرگ رفیق شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے اسے بڑی محنت اور دلچسپی سے ٹیپ کی ریل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جسے چار اقساط میں ماہنامہ 'حکمتِ قرآن' کی زینت بنا دیا گیا۔ بعد میں جب یہ خطاب روزنامہ 'جنگ' میں 'الہدیٰ' کے زیر عنوان شائع ہوا تو خود محترم ڈاکٹر صاحب نے اس پر نظر ثانی فرما کر اس میں مناسب اصلاح و ترمیم بھی کر دی تھی۔

دوسری تقریر جو اس کتابچے میں شامل ہے' اوائل ۱۹۹۰ء میں ہاشو آڈیٹوریم کراچی میں ہوئی' عنوان تھا "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باہمی تعلق اور 'نہی عن المنکر' کی خصوصی اہمیت"۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس خطاب میں آیاتِ قرآنی اور احادیث رسول کی روشنی میں بڑی تفصیل سے واضح کیا ہے کہ علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام یہی 'نہی عن المنکر' ہے۔ اس اہم تقریر کو مرتب کر کے 'میثاق' کی ماہ اپریل اور ماہ جون کی اشاعتوں میں شائع کیا گیا۔

اضافی طور پر اس کتابچے میں مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج کے زیر عنوان مجددِ تبلیغ مولانا محمد الیاسؒ کے افکار پر مبنی مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی ایک اہم تحریر شامل کی گئی ہے۔ اس حد درجہ جامع تحریر کے ذریعے نہ صرف یہ کہ کتابچے میں شامل دونوں خطابات کے بعض اہم مضامین کا اعادہ ہو جاتا ہے بلکہ ان کے مندرجات کی تصویب و توثیق بھی ہو جاتی ہے۔ مولانا کاندھلوی کی یہ تحریر جماعتِ تبلیغی کی معروف کتاب 'تبلیغی نصاب' میں شامل ہے۔ چنانچہ ہم نے کتب خانہ شان اسلام اُردو بازار کے شائع کردہ 'عکسی تبلیغی نصاب جہیز ایڈیشن' سے اس مضمون کا عکس حاصل کر کے زیر نظر کتاب میں اسے شامل کیا ہے۔

ناظم نشر و اشاعت مرکزی انجمن خدام القرآن

اُمّتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کو دعوت رجوع الی القرآن کے اس کام کی جڑ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اس کا حصہ اوّل چند نہایت جامع اسباق پر مشتمل ہے جن میں انسان کی نجات اور فوز و فلاح کے جملہ لوازم کو نہایت جامعیت کے ساتھ یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسی جامعیتِ کبریٰ کی حامل ہے سورۃ العصر، پھر یہی شان ہے آیۂ بِرّ[1] کی اور اسی جامعیت کا مظہر اتم ہے سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع ——— قرآن حکیم کا ایک ایسا ہی جامع مقام سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ پر مشتمل ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے بھی سورۃ العصر کی شان کا حامل ہے اور حسن اتفاق سے جس طرح سورۃ العصر تین آیات پر مشتمل ہے اسی طرح یہاں بھی تین ہی آیات میں ایک مکمل لائحہ عمل بیان کر دیا گیا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ سورۃ العصر میں بات ایک قاعدہ کلیہ اور حقیقتِ عمومی (UNIVERSAL TRUTH) کے انداز میں بیان ہوتی ہے اور سورۂ آل عمران کے اس مقام پر خطاب براہِ راست اُمّتِ مسلمہ سے ہے، تو آیئے کہ پہلے ان آیات کی تلاوت کر لیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

---

[1] البقرہ: ۱۷۷ "لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ .... الآیہ"

"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرمانبردار ہو۔ اور چمٹ جاؤ اللہ کی رسّی کے ساتھ مجموعی طور پر اور باہم تفرقہ میں مت پڑو۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہوئی۔ جبکہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے تک جا پہنچے تھے لیکن اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو! اور چاہیے کہ تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے ——— اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"

یہ آیاتِ مبارکہ اس سورت کے قریباً وسط میں واقع ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ سورۂ آلِ عمران دو سو آیات پر مشتمل ہے اور اِن آیات کا نمبر ہے ۱۰۲، ۱۰۳، اور ۱۰۴۔ گویا قریباً وسط ہے۔ میرے نزدیک اِن آیات میں ہم مسلمانوں کے لیے ایک لائحہ عمل ہے، اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت میں علمی نکات بھی ہیں، حکمت و فلسفہ کے مسائل بھی ہیں اور عملی رہنمائی بھی ہے۔ چنانچہ ان میں بھی یقیناً علمی اعتبار سے بڑے وقیع نکات ہیں، لیکن آج میری گفتگو ان کے عملی پہلوؤں کے بیان تک محدود رہے گی۔ اس لیے کہ علمی نکات پر توجّہ کا ارتکاز زیادہ ہو جاتے تو اکثر و بیشتر عملی رہنمائی کی طرف توجّہ نہیں ہوتی، لہٰذا آج میری کوشش یہ ہو گی کہ اِن آیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے جو عملی لائحہ عمل ہمارے سامنے آتا ہے اُسے میں آپ کے سامنے رکھوں۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے قرآن مجید کی یہ تین آیات اس عملی رہنمائی اور ہدایت کے اعتبار سے جو وہ اہلِ ایمان کے سامنے رکھتا ہے قرآن حکیم کے جامع ترین مقامات میں سے ہیں۔ امّتِ مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیّت سے ایک مسلمان کے کیا فرائض ہیں اور اس پر کیا ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں! اِسے سب سے پہلے کن امور پر اپنی توجہات کو مرتکز کرنا ہوگا! اِن کو بڑی جامعیت کے ساتھ پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری آیت کا موضوع یہ ہے کہ اِن افراد کو باہم جوڑنے والی چیز، انہیں ایک امّت بنانے والی شے، انہیں "حزب اللہ" بنانے

والی چیز، ان کے مابین ذہنی و فکری ہم آہنگی اور عملی اتحاد پیدا کرنے والی چیز کون سی ہے!! —— اور تیسری آیت میں یہ نشاندہی فرمائی گئی کہ اس امت یا حزب اللہ یا اس جماعت کا مقصد کیا ہے!!! کس کام کے لیے اس کو محنت اور جدّ و جہد کرنی ہے!

اب آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ ان تین آیات کے مابین بڑا منطقی ربط ہے۔ اس لیے کہ بڑی سے بڑی اجتماعیت بھی افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے خوب کہا ہے کہ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

افراد کا رُخ دُرست نہ ہو تو اجتماعیت کا رُخ کیسے درست ہو جائے گا! اگر افراد وہ لائحہ عمل اختیار نہ کریں جو اُن کو دیا گیا ہے تو اجتماعی زندگی کے لیے جو صحیح لائحہ عمل ہے، اُسے کیسے اختیار کیا جا سکتا ہے! لہٰذا ترتیب یہی ہے کہ سب سے پہلے ہر فرد اپنے طور پر سوچے کہ مجھے کیا کرنا ہے! مجھ سے تقاضا کیا ہے! مجھ سے مطالبہ کیا ہے! میں اس بات کو سمجھانے کے لیے مسجد کے منبر کی مثال دیا کرتا ہوں، چونکہ عام طور پر اس کی تین سیڑھیاں ہوا کرتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص چھلانگ لگا کر تیسری سیڑھی پر چڑھنا چاہے گا تو اوندھے منہ گرے گا۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ اوّلاً پہلی سیڑھی پر، پھر دوسری سیڑھی پر اور پھر تیسری سیڑھی پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ ان آیات میں گویا عملی اعتبار سے یہ تین مراحل ہیں۔ یہ تین سیڑھیاں ہیں جو ہمارے سامنے آرہی ہیں۔

انفرادی لائحہ عمل

اب پہلی آیت پر توجہ مرکوز فرمایئے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ "اے اہلِ ایمان! یا اے ایمان کے دعوے دارو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے۔ اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو" —— یہ بات سمجھنے کی ہے کہ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصّہ مکّی سورتوں اور آیتوں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں آپ کو کہیں "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ نہیں ملیں گے۔ زیادہ سے زیادہ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں آتے ہیں، لیکن اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں

اختلاف ہے کہ یہ مکّی ہے یا مدنی۔ میرا خیال یہ ہے کہ سورۃ الحج برزخی سورت ہے۔ اس میں مکّی آیات بھی شامل ہیں، مدنی بھی اور سفرِ ہجرت کے دوران نازل ہونے والی آیات بھی۔ واللہ اعلم!

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے خطاب مدنی دور میں شروع ہوا ہے جبکہ ایک امت کی تشکیل بالفعل ہو چکی تھی۔ لہٰذا امتِ مسلمہ سے خطاب کے لیے یہ عنوان اختیار کیا گیا، ورنہ اہلِ ایمان سے خطاب کے لیے سورۃ العنکبوت میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے: "یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" "اے میرے بندو جو ایمان لائے"۔ یا سورۃ الزّمر میں یہ الفاظ مل جائیں گے: "یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ" "اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر (گناہ کرکے) زیادتی کی ہے"۔ لیکن "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ مدنی سورتوں میں کثرت کے ساتھ آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجرات کل اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ آیات کا آغاز "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے ہوتا ہے اور دوسری طرف سورۃ الاعراف جو چوبیس رکوعوں پر مشتمل ہے اور وہ حجم کے اعتبار سے طویل ترین مکّی سورت ہے، اس میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ جبکہ آیات کے اعتبار سے سورۃ الشعراء سب سے بڑی مکّی سورت ہے جس کی آیات کی تعداد ۲۲۷ ہے۔ لیکن ان طویل مکّی سورتوں میں بھی کہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب نہیں ملے گا۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ سمجھیے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے خطاب امتِ مسلمہ سے ہے اور یہ اندازِ تخاطب مدنی سورتوں میں نظر آتا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیے کہ سورۂ آل عمران کا غالب حصہ ۳ھ میں نازل ہوا ہے یعنی غزوۂ احد کے متصلاً بعد۔ لہٰذا ۳ھ کے حالات کو اپنے ذہن میں لائیے! مدینہ میں جہاں ایک کثیر تعداد مومنین صادقین کی ہے، جس میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی، جن کے متعلق سورۂ توبہ میں فرمایا: "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ"، وہاں ساتھ ہی کچھ ضعیف الایمان لوگ بھی ہیں بلکہ منافقین بھی ہیں۔ یہ گروہ وہاں عبداللہ بن اُبَی کی سرکردگی میں حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت ہی سے وجود میں آ گیا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تو ایک ہزار افراد آپؐ کے ساتھ تھے، لیکن پھر عبداللہ بن اُبَی کے ساتھ تین سو افراد راستہ ہی سے

واپس چلے گئے اور حضورؐ کے ساتھ صرف سات سو افراد رہ گئے۔ اگر وہ تین سو افراد سب کے سب منافق نہیں تھے تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں منافق بھی تھے اور ضعیف الایمان لوگ بھی تھے اس لیے کہ جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں جبکہ یقین سے معلوم ہو کہ جنگ ہو کر رہے گی، ان کے لیے ہلکے سے ہلکے الفاظ ہم یہی کہہ سکتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اُس موقع پر معاملہ گڈمڈ تھا کہ صادق الایمان لوگ بھی حضورؐ کے ساتھ تھے، ایسے لوگ کہ جن کے ایمان و یقین کی وسعت و گہرائی کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان کی گہرائی اور گیرائی کا ہم کیا تصوّر کریں گے! وہاں کمزور ایمان اور کمزور قوّتِ ارادی والے لوگ بلکہ منافقین بھی موجود تھے۔ لیکن قرآن ان سب سے جب خطاب کرتا ہے تو 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ سے کرتا ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ پورے قرآن مجید میں کہیں 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا' نہیں آیا۔ یعنی 'اے منافقو!' کہہ کر کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ جہاں منافقین سے بات ہوئی ہے وہاں بھی 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' ہی سے ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایمان کے دعوے دار تو وہ (یعنی منافقین) بھی تھے، کلمۂ شہادت وہ بھی پڑھتے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نمازیں وہ بھی ادا کرتے تھے، لیکن جب انہیں جنگ کے لیے پکارا جاتا تھا یا جب ان سے انفاق کا تقاضا ہوتا تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو یا اللہ کی راہ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلو، تب ان کی جان نکلتی تھی۔ نمازیں وہ پابندی سے پڑھتے تھے، اگرچہ ان کی قلبی کیفیت کے اظہار کے لیے قرآن میں 'کُسَالٰی' کا لفظ آیا ہے کہ نماز کے لیے اُٹھتے بھی ہیں تو بڑے کسل کے ساتھ۔ ایک کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ انسان پوری دل کی آمادگی کے ساتھ اُٹھے، پورے ذوق و شوق کے ساتھ اُٹھے، جس کا ایک درجہ وہ بھی ہے جسے ایک حدیث مبارک میں ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا کہ 'وَرَجُلٌ قلبُہ مُعَلَّقٌ بالمساجد' ("اور وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے") اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جسے لفظ 'کُسَالٰی' سے تعبیر فرمایا گیا۔

بہرحال جن آیات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں ان میں 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے خطاب ہے۔ چنانچہ اہلِ ایمان سے پہلا تقاضا کیا گیا: "اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ"

"اے ایمان کے دعوے دارو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے"۔ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے! بچ کر چلنا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا، تقویٰ کا اصل مفہوم یہی ہے۔ حضرت اُبیؓ ابن کعب رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی ہیں جن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: "اقرؤھم ابی ابنؓ کعب"۔ ("صحابہ کرامؓ میں قراءتِ قرآن کے سب سے بڑے عالم یہ حضرت ابی ابن کعب ہیں") ان سے ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ "تقویٰ" کیا ہے! آپ اسے کیسے DEFINE کریں گے؟ تو حضرت اُبی بن کعبؓ نے اس لفظ کی بڑی خوبصورت تشریح کی جسے صحابہ کرامؓ کی اس مجلس کے تمام شرکاء نے تسلیم کیا کہ بے شک یہ اس لفظ کی بہترین تعبیر ہے۔ ان کی توضیح کو میں اپنے الفاظ میں بیان کروں تو وہ یہ ہے:

'امیر المومنین! جب کسی شخص کو جنگل میں ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو، جس کے دونوں اطراف میں خاردار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور ان کے کانٹوں سے اُلجھنے نہ پائیں تو اس احتیاطی رویّے کو تقویٰ کہا جائے گا'

اب اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اس آیت پر اپنی توجّہات کو مرتکز کیجئے۔ ایمان کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ آپ نے توحید کے التزام کے ساتھ اللہ کو مانا، یوم آخرت کا اقرار کیا اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانا۔ اب ان ایمانیاتِ ثلاثہ کا تقاضا کیا ہے؟ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو مانیے! وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (التغابن: ۱۲) "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ صاف صاف پہنچانے کے سوا ہمارے رسولؐ پر کوئی اور ذمّہ داری نہیں ہے"۔ اور وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ

عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (الحشر: ۷) "اور جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم دیں اُسے مضبوطی سے تھاما اور جس سے روکیں، اُس سے رک جاؤ۔" آخرت پر ایمان لانے کا تقاضا کیا ہے؟ یہ کہ:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (البقرة: ۱۲۳) "اور بچو اس دن (کی سزا) سے کہ جس دن کوئی شخص کسی کے ذرا بھی کام نہیں آئے گا اور نہ قبول کیا جائے گا اس کی طرف سے کوئی فدیہ اور نہ کام آئے گی اس کے حق میں کسی کی سفارش اور نہ کسی کی طرف سے ان کو مدد پہنچے گی۔"

پس پہلا تقاضا ہے تقویٰ ــــــ اگر واقعتاً ایمان دل میں ہے تو ہر لفظ زبان سے نکالنے سے پہلے انسان سوچے گا کہ میرے اس لفظ سے اللہ راضی ہو گا یا ناراض! میں اس کو قیامت کے دن JUSTIFY کر سکوں گا یا نہیں! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے کہنے کا مجھے حق حاصل ہے یا نہیں! ہر حرکت جو ہمارے اعضاء و جوارح سے ہو، وہ ہاتھ سے ہو، پاؤں سے ہو، یہاں تک کہ آنکھ کی حرکت کی بھی جوابدہی کرنی ہو گی۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اے علی! کسی نامحرم عورت پر پہلی مرتبہ اچانک نگاہ پڑ جائے تو وہ معاف ہو گی، لیکن دوسری مرتبہ اگر نگاہ اٹھی تو وہ معاف نہیں ہے اس لیے کہ یہ انسان کا ارادی عمل ہے معلوم ہوا کہ زبان، آنکھ، کان کا ہر ارادی عمل مسؤل ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل: ۳۶) آپ نے سنا ہو گا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ طرزِ عمل تھا کہ جب کبھی کسی راستہ میں ان کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آتی تھی تو فوراً اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور ساتھ چلنے والے سے پوچھتے تھے کہ اب تو آواز نہیں آ رہی! جب ان کو بتا دیا جاتا تھا کہ آواز نہیں آ رہی تب وہ کانوں سے انگلیاں نکالتے تھے معلوم ہوا کہ ہمارا پورا وجود، ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ان سب کے استعمال میں ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔ زبان کے بارے میں تو حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جہنم میں سب سے زیادہ لوگوں کو جھونکنے والی شے یہ زبان ہے۔ زبان کے غلط استعمال کو حضورؐ نے "حصائدُ الالسنۃ" قرار دیا ہے یعنی زبان کی وہ کھیتیاں جو آخرت میں کاٹنی ہوں گی۔ قرآن خبر دیتا ہے کہ انسان کوئی لفظ منہ سے نہیں نکال پاتا مگر یہ کہ اس کے پاس ہی ایک ہوشیار نگران تیار رہتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق: ۱۸) پھر یہ کہ ہمارے جو اعضاء و جوارح ہیں ان سے جو حرکت بھی سرزد ہو وہ اس احساس کے تحت ہو کہ مجھے اس کی جوابدہی کرنی ہوگی اور آخرت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا، ACCOUNT FOR کرنا ہوگا۔ یہ احساس اور یہ روش تقویٰ ہے۔ فرمایا کہ اتنا تقویٰ اختیار کرو جتنا اللہ کے تقویٰ کا حق ہے: اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ـــــ معمولی تقویٰ مطلوب نہیں ہے بلکہ پوری حدود و قیود کے ساتھ مطلوب ہے۔ "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کی شان والا تقویٰ درکار ہے۔ ہم اور آپ تلاوت کرتے وقت اس آیت پر سے سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ ہمیں خیال ہی نہیں آتا کہ قرآن کی یہ آیت ہم سے کیا مطالبہ کر رہی ہے! لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس پر گھبرا گئے، لرز اٹھے کہ کس انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اتنا تقویٰ اختیار کر سکے جتنا اللہ کا حق ہے۔ یہاں تو گویا یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کسی لمحہ بھی کوئی جنبش اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو، جبکہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے خطا ہو سکتی ہے۔ کہیں جذبات سے مغلوب ہو کر، کہیں غیر شعوری طور پر، کہیں بھول میں خطا کا صدور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ گھبرا گئے اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ ہم میں سے کون ہو گا جو اللہ کا ایسا تقویٰ اختیار کر سکے جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور، بڑا رحیم، بڑا رؤف ہے اس نے ان مومنین صادقین کی دل جوئی اور اطمینان کے لیے سورۃ التغابن میں یہ وضاحت فرمائی: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے حدِ امکان میں ہے۔" اب صحابہؓ کی جان میں جان آئی کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق تو کر سکتا ہے ـــــ لیکن یہاں مغالطہ نہ ہو جائے کہ تقویٰ کی روش اختیار کرنے کی شعوری کوشش یہ سمجھ کر چھوڑ دی جائے کہ ہم میں اس کی استطاعت ہی نہیں ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کو اس نے کتنی استطاعت دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہو گیا کہ مجھ میں فلاں فرائضِ دینی کی بجا آوری کی استعداد و استطاعت ہی نہیں ہے تو جان لیجئے کہ یہ خالص شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ والا معاملہ ہو جائے گا۔

اب اگلے ٹکڑے پر توجہ فرمائیے۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر:

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا۔ "اور ہرگز مت مرنا مگر اسلام (فرماں برداری) کی حالت میں"۔ اسلام کِسے کہتے ہیں؟ سرِ تسلیم خم کرنے کو ——— فارسی میں اس کی تعبیر ہوگی گردن نہادن، انگریزی میں اسے TO SURRENDER اور TO SUBMIT کہا جائے گا۔ یعنی کوئی مقابلہ تھا اس میں اگر آپ نے ہتھیار رکھ دیئے اور سپر ڈال دی تو اس رویہ کا نام اسلام ہے۔ تو یوں سمجھیے کہ ہمارا نفس اکثر و بیشتر اللہ سے سرکشی کرتا ہے۔ اللہ کا حکم کچھ ہے نفس کا تقاضا کچھ اور ہے۔ خیر و شر کی یہ کشمکش اور کشاکش انسان کے باطن میں چلتی رہتی ہے، لیکن جب انسان ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ اب جو اللہ کا حکم ہوگا اور اس کے رسولؐ کا حکم ہوگا بجا لائیں گے، جو ان کا فرمان ہوگا اس کے مطابق عمل کریں گے تو یہ اسلام ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالتِ اسلام میں"۔ اس کلام میں جو بلاغت ہے اس پر غور فرمائیے کسی انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے کہ وہ کتنی مہلتِ زندگی لے کر آیا ہے اور اس کی موت کب واقع ہوگی۔ مجھے کوئی پتہ نہیں، ہو سکتا ہے کہ ابھی درس کے بعد مسجد سے نکلوں اور کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے اور یہ زندگی ختم ہو جائے۔ آپ کا مشاہدہ ہوگا کہ بسا اوقات صبح لوگ گھر سے اپنے کاروبار کے لیے نکلتے ہیں اور شام کو گھر پر یا لاش پہنچتی ہے یا موت کی اطلاع ملتی ہے۔ تو چونکہ موت کا کوئی وقت ہمیں معلوم نہیں لہٰذا اگر کوئی شخص یہ طے کر لے کہ "میں ہرگز نہیں مروں گا مگر فرمانبرداری کی حالت میں" تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسے ہر لمحہ چوکس ہو کر بسر کرنا ہوگا کہ زندگی کا کوئی لمحہ معصیت میں بسر نہ ہو۔ کیا پتہ موت کا پنجہ کب آ کر دبوچ لے! کسی کے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے، کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اسی معصیت والے لمحہ میں موت نہیں آ جائے گی۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے میں آپ کے سامنے ایک حدیث رکھتا ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے:

لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ۔ "کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا، کوئی چور ایمان کی حالت میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا"۔

گویا — جس وقت وہ یہ عمل کر رہا ہے اس وقت ایمان کی اصل حقیقت اس کے دل سے نکل چکی ہوتی ہے اگرچہ وہ اس معصیت سے کافر نہیں ہوتا، یہ بات ذہن میں رکھیے! امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف صد فی صد درست ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہو جاتا۔ لیکن وہ قلبی یقین والا ایمان اس وقت موجود نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو زنا کیسے کرے! اگر وہ قلبی ایمان ہو تو چوری کیسے ہو! شراب کیسے پیتے! اب آپ غور کیجئے کہ جس وقت کوئی شخص ان میں سے کوئی کام کر رہا ہے اور عین اس وقت اس کی رُوح قبض کر لی جائے تو یہ موت کس قدر حسرتناک موت ہوگی۔ یہ فرمانبرداری کی حالت کی موت تو نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس حالتِ نافرمانی کی موت ہوتی۔ اس سے بچنے کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ انسان محتاط رہے کہ کوئی بھی لمحہ نافرمانی میں بسر نہ ہو۔

میں یہ عرض کر دوں کہ تقویٰ کے موضوع پر میرے محدود علم کی حد تک قرآن مجید کا سب سے زیادہ تاکیدی مقام یہی ہے۔ تقویٰ کے ساتھ تو فرمایا: حَقَّ تُقٰتِهٖ یعنی تقویٰ اختیار کرو جتنا اللہ کا حق ہے اور آگے فرمایا: "دیکھنا ہرگز موت نہ آئے مگر حالتِ فرمانبرداری میں" وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یہ ہے پہلا نکتہ اور یہ ہے پہلی سیڑھی جس پر ہر مسلمان کو مضبوطی سے قدم جمانے کی پُرزور تاکید اور حکم آیا ہے۔ اور اگر یہیں قدم نہیں جمے ہیں تو اگلی بات کرنا بیکار ہے، بلکہ اس صورت میں اگلی بات کرنا ذہنی عیاشی بن جاتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں یہود کے علماء کے بارے میں کہا گیا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ "کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درآنحالیکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔" (البقرہ: ۴۴) یعنی تمہارے پاس توریت موجود ہے۔ یہ طرزِ عمل جو یہود کے علماء کا تھا ہمیں اپنے معاشرہ میں بھی نظر آ جاتا ہے کہ تلقین بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی ہے، بڑے اعلیٰ مقالات بھی لکھے جا رہے ہیں، بڑی عمدہ تقاریر بھی ہو رہی ہیں لیکن قریب ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عملی زندگی میں وہ تقویٰ، وہ اسلام، وہ فرمانبرداری کی روش اور وہ حلال و حرام کی پابندی مفقود ہے، حالانکہ ہمارے دین کا بنیادی تقاضا ہر فرد سے یہ ہے کہ وہ امکانی حد تک تقویٰ اختیار کرے اور اللہ اور رسولؐ کا فرمانبردار بنے۔

بہر حال قرآن کے عطا کردہ سہ نکاتی لائحہ عمل کا پہلا قدم یہ ہے۔ اس سیڑھی پر اپنے

قدموں کو جمانا ضروری ہے۔ اس موضوع پر مزید وقت صرف کیے بغیر میں اس ضمن میں صرف ایک اور بات عرض کروں گا اور وہ یہ کہ ہمارے یہاں بعض اوقات یہ تصوّر نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے کہ خواہ تقویٰ ہو، خواہ اسلام ہو، خواہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری ہو یہ تمام باتیں من حیث الکل مطلوب ہیں۔ یعنی پوری زندگی میں تقویٰ ہے تو حقیقی تقویٰ ہے۔ لیکن اگر معاملہ یہ ہوجائے کہ زندگی کے ایک گوشے میں آپ اللہ کے احکام کی بڑی پابندی کر رہے ہیں مثلاً آپ نے متّقیوں کی سی وضع قطع اختیار کرلی ہے لیکن کاروبار میں آپ اسلام کے خلاف طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ ناجائز اور حرام ذرائع اپناتے ہوتے ہیں تو جان لیجئے کہ یہ صورتِ حال تقویٰ کے منافی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ۔ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو چھپے اور کھلے ہر حال میں"۔ ایک مرتبہ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے تین بار اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا۔ اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا۔ اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا۔ "تقویٰ یہاں ہوتا ہے"۔ تقویٰ اگر دل میں ہوگا تو پورے وجود میں سرایت کرجائے گا۔ پھر وہ تقویٰ پوری شخصیت کو اس رنگ میں رنگ دے گا جسے قرآن مجید میں 'صِبْغَۃُ اللّٰہ' کہا گیا ہے: صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً (البقرہ: ۱۳۸) لیکن اگر ایسا نہیں ہے، صرف ایک جزو میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابندی ہے اور دیگر معاملات میں آزادی اختیار کی گئی ہے تو یہ دراصل یہود کا سا طرزِ عمل ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ میری امّت میں بھی وہ ساری برائیاں پیدا ہوں گی جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اگر وہ یعنی بنی اسرائیل گوہ کے بل میں گھُسے تھے تو تم بھی گھُسو گے۔ یہاں تک الفاظ ہیں، اگرچہ بیان کرتے ہوئے جھجک پیدا ہوتی ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں تو آپ کو سناتا ہوں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا بدبخت پیدا ہوا جس نے اپنی ماں سے زنا کیا ہو تو تم میں سے بھی کوئی بدبخت ایسا ضرور پیدا ہوگا"۔

مراد یہ ہے کہ وہ تمام دینی، اعتقادی، فکری، علمی اور عملی خرابیاں جو سابقہ امّت (یعنی بنی اسرائیل) میں پیدا ہوئیں، وہ سب اس امّت یعنی امّتِ مسلمہ میں بھی پیدا ہوں گی۔ حدیث کا متن حسب ذیل ہے:

لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِىْ اُمَّتِىْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ۔

"میری امّت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

نہایت فصیح و بلیغ تشبیہ ہے۔ جوتی کے ایک جوڑے کو دیکھئے تو چونکہ پنجے کا رُخ مختلف ہوتا ہے اس لیے آپ کو بظاہر ایک جوتی دوسری جوتی سے مختلف نظر آئے گی لیکن ان کے تلووں کو جوڑ دیتے تو بالکل ایک ہوں گی۔ اسی طرح بنی اسرائیل اور امّتِ مسلمہ کے احوال میں ظاہراً تو فرق موجود ہے اس لیے کہ بہر حال چودہ سو برس کا فاصلہ ہے۔ چنانچہ ظاہری اعتبار سے کچھ نہ کچھ فرق ہے لیکن بین السطور دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سرِ مُو کوئی فرق نہیں۔ تو وہ کیفیت جو قرآن مجید میں یہود کے بارے میں فرمائی گئی، ہم میں سے ہر شخص کو اپنے گریبان میں خود جھانکنا چاہیے کہ کہیں ہم تو اس میں مبتلا نہیں ہیں ؟ اور کہیں اس آئینہ میں ہمیں اپنی صورت تو نظر نہیں آ رہی ہے!

قرآن مجید میں یہود کو مخاطب کر کے فرمایا: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج "کیا تم کتاب اور شریعت کے ایک حصّہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے ؟" فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا —— تو کان کھول کر سن لو کہ "تم میں سے جو کوئی بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا اس کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کو ذلیل و خوار کر دیا جائے" اور وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط "اور قیامت کے دن ان کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا" (البقرہ: ۸۵) یہ ہے اللہ کی وعید ان لوگوں کے لیے جو دین کے حصّے بخرے کر لیں کہ زندگی کے ایک حصّے میں تو دین پر چلوں گا اور جو دوسرے گوشے ہیں تو ان کے لیے عذرات کا پلندہ ہے کہ اجی کیا کروں ؟ یہ تو مجبوری ہے۔ یہ تو زمانے کا چلن ہے۔ یہ تو برادری کا رواج ہے۔ شادی بیاہ کی رسومات کا مسئلہ تو عورتوں سے متعلق ہے اس میں ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ کاروبار چل نہیں سکتا جب تک بینکوں سے سُودی لین دین نہ ہو۔ کیا کریں! مہنگائی بہت ہے، گزارا مشکل ہے۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ ہے، رشوت نہ لیں تو کام

کیسے چلے گا؟ اب پردے کا رواج کہاں رہا ہے! ہم اپنی خواتین کو پردہ کرائیں گے تو دقیانوسی اور رجعت پسند کہلائیں گے — یہ بہانے بنا کر ہم نے زندگی کو تقسیم کر لیا ہے کہ ایک حصّہ میں تو شریعت کی پابندی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حصّہ بہت محدود ہے اور جو دوسرا وسیع تر حصّہ ہے وہ شریعت سے آزاد ہے۔ تو قرآن مجید کی رُو سے اس پر تبصرہ وہ ہے جو میں نے سورۃ البقرہ کی آیت کے حوالہ سے ابھی آپ کو سنایا ہے۔

نکتہ دوم: حیاتِ ملّی کا استحکام

اب آئیے دوسری آیت پر۔ وہ لوگ جو پہلی آیت کے تقاضوں — تقویٰ اور اسلام پر کسی نہ کسی درجے میں عمل کر رہے ہوں — میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کر چکے ہوں۔ اس لیے کہ انسان موت تک کبھی یہ طے نہیں کر سکے گا کہ میں یہ تقاضے پورے کر چکا ہوں۔ کون شخص یہ دعویٰ کر سکے گا کہ میں نے اللہ کا اتنا تقویٰ اختیار کر لیا جتنا کہ اس کا حق ہے۔ کوئی انسان اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جب صحابہ کرامؓ گھبرا گئے تو ہم میں سے کون ہو گا جو اس کی جرأت کر سکے۔ لہٰذا جو اس پر عمل کے لیے کوشاں ہوں، اس کے لیے مسلسل جدّوجہد کر رہے ہوں، اب ان کو آپس میں جڑنا چاہیے، اس لیے کہ جب تک وہ آپس میں مربوط نہیں ہوں گے، بنیانِ مرصوص نہیں بنیں گے، اس وقت تک وہ دنیا میں کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز کام نہیں کر سکتے۔ آپ کو کوئی بھی چھوٹا بڑا کام کرنا ہو، خواہ وہ بھلائی کا ہو یا برائی کا، اس کے لیے اجتماعیت ناگزیر ہے۔ اب بات سمجھانے کے لیے ایک مثال پیش کر رہا ہوں کہ جو لوگ جیب کاٹنے کا پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کا بھی اگر اپنا ایک جتھہ نہ ہو، ایک گروہ نہ ہو، اُن کا کوئی گُرو نہ ہو اور وہ شہر کے علاقے ان کے مابین تقسیم نہ کرتا ہو، روزانہ سارے جیب کترے اپنی کمائی لے جا کر اس کے قدموں میں نہ ڈال دیتے ہوں تو یہ پیشہ بھی "کامیابی" سے نہیں چل سکتا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کا بڑا مضبوط جتھہ ہوتا ہے اور اس میں بڑا سخت نظم ہوتا ہے، ورنہ وہ کیسے بڑے بڑے ڈاکے ڈال سکیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ کوئی کام چاہے خیر کا ہو خواہ شر کا، اس کے لیے اجتماعیت ناگزیر

ہے اور اس کے کارکنوں کا باہم مربوط ہونا لازم ہے۔ خیر کا سب سے عظیم کام وہ ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دیا۔ میں اس کا ذکر آگے کروں گا۔ اس کام کے لیے ظاہر بات ہے کہ اجتماعیت کی ضرورت ہے لیکن جس طرح کسی فصیل کے لیے پختہ اینٹ کی ضرورت ہے۔ آپ ناپختہ اینٹ کو لگادیں تو دیوار کمزور رہے گی، لہٰذا پہلی چیز کیا ضروری ہے؟ یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو۔ اب انسانی اجتماعیت میں اینٹ کی جگہ فرد کو متصوّر کیجیے۔ مسلم اجتماعیت کی ہر اینٹ کی پختگی کا پروگرام تو پہلی آیت میں آچکا: ﴿يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾۔ اب ان اینٹوں کو باہم جوڑنا ہے۔ خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو جوڑنے والا مسالہ کونسا ہے! اس کا جواب ہے اس دوسری آیت میں: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ — "اور مضبوطی سے پکڑلو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور جمع ہو کر" یا اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ "پوری کی پوری رسّی کو" اس لیے کہ یہاں "جَمِیْعًا" حال ہے۔ کس کے لیے حال ہے! تو ایک صورت تو یہ ہے کہ جن کو حکم دیا جارہا ہے وہ سب کے سب مل جل کر اس رسّی کو مضبوطی سے پکڑیں اور دوسری یہ کہ پوری رسّی کو تھامیں۔ اس کے کسی ایک جزو کو نہیں۔ اب یہ رسّی کون سی ہے! یہ ہے اصل سوال۔ یہاں قرآن مجید کے اصولوں میں سے ایک اصول کو جان لیجیے! اگر قرآن مجید میں کوئی ایسا لفظ یا حکم آگیا ہے جس کی وضاحت درکار ہے تو پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کی تشریح کر دیتا ہے۔ مفسّرین کے یہاں یہ اصُول تسلیم کیا جاتا ہے کہ: "اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا" قرآن کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کی تفسیر کر دیتا ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ آپ کو قرآن مجید میں کہیں دوسری جگہ اس کی توضیح نہیں ملی۔ اب قرآن مجید کو سمجھنے کا دوسرا ذریعہ کیا ہے؟ وہ ہے سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں یہ فرمایا ہے کہ اے نبی! یہ آپ کا فرضِ منصبی ہے کہ جو کتاب ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں آپ اس کی وضاحت فرمائیں: ﴿وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾[1] "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ الذّکر، یہ کتاب، یہ قرآن، یہ نصیحت آپؐ پر نازل کی گئی ہے تاکہ آپؐ اس کی تبیین کریں، اس کی وضاحت کریں ان لوگوں کے لیے جن کیلئے

---

[1] النحل: ۴۴

اسے ہم نے اتارا ہے"۔ لہٰذا ہمارا دوسرا طریقہ کیا ہوگا! یہ کہ سنّت و حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کریں کہ یہاں جو 'حبل اللہ' فرمایا گیا ہے اس سے مراد کیا ہے! مجھے اِن حضرات سے اختلاف ہے جنہوں نے اس کے معنی خود معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ اگر حبل اللہ کا مفہوم احادیث میں نہ ہوتا اور وہ احادیث مرفوع نہ ہوتیں یا سند کے اعتبار سے مضبوط نہ ہوتیں تب تو معاملہ دوسرا ہو سکتا تھا لیکن جہاں ہمیں مرفوع حدیث مل جائے اور وہ ثقہ ہو، مضبوط ہو، مستند ہو، روایت کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہو تو پھر اس کے بعد اپنا 'قول' لگانے کی کوشش کرنا، اپنا فلسفہ بیان کرنا، میرے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہو جائے گی۔ جہاں کوئی چیز نہیں ملی وہاں آپ غور کیجیے، اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا لیتے لیکن جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مل جائے وہاں اپنی عقل، اپنی سوچ اور محض لغوی معنوں پر بحث میرے نزدیک غلط ہے۔ اب میں اختصار کے ساتھ آپ کو حضورؐ کی تین احادیث سنا دیتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'حبل اللہ' کا کیا مفہوم و مطلب معین فرمایا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قرآن کی عظمت و فضیلت کے بارے میں ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اس میں حضورؐ نے قرآن کے بارے میں فرمایا: هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ۔ "یہ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے"۔ (ترمذی و دارمی)

دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:
قالَ رسولُ اللّٰه صلی الله علیه وسلم: "القرآنُ حبلُ اللّٰهِ الممدودُ من السّماءِ الی الارض" ——— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن ہی اللہ کی وہ رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے"۔

تیسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جُبیر ابن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور بڑی ہی پیاری حدیث ہے۔ اس کے اندر جو تفصیل آئی ہے وہ ایسی ہے کہ جس کو سُن کر تھوڑی دیر کے لیے انسان اپنے آپ کو دورِ نبوی کے ماحول میں موجود محسوس کرنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے برآمد ہوئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ مسجد نبوی کے ایک گوشے میں چند صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں اور قرآن پڑھ رہے ہیں اور آپس میں سمجھ سمجھا رہے ہیں۔ گویا قرآن مجید

کا مذاکرہ ہو رہا ہے۔ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت کے آثار نمایاں ہوتے۔ آپؐ ان کے پاس تشریف لاتے اور ان سے ایک عجیب سوال کیا۔ آج آپ حضرات بھی یہ سوال اپنے آپ سے کیجئے اور پھر سوچیے کہ جو جواب صحابہ کرامؓ نے دیا تھا کیا وہ جواب ہم بھی اپنے قلب کی گہرائی سے دے سکتے ہیں! سوال کیا تھا: "اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟" "کیا تم اس بات کے گواہ نہیں ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور یہ کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟" صحابہ کرامؓ کا جواب تھا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ "یقیناً اے اللہ کے رسول" (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم بھی قلب کی گہرائی سے یہی گواہی دے سکیں۔ اپنی زبان کی نوک سے تو ہم سب اس کی گواہی دیتے ہیں کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، لیکن جب یہ گواہی ہمارے قلب کی گہرائی سے اُبھرے تب ہے اصل گواہی۔ جس کے لیے اقبال نے کہا ہے کہ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

اور ع "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی"

صلی اللہ علیہ وسلم۔ بہرحال جب صحابہؓ نے یہ جواب دیا: "بلیٰ یا رسول اللہ" تب حضورؐ نے فرمایا: "فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا۔" "تو اب خوشیاں مناؤ۔ اس لیے کہ قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ گمراہ"—— اب بتائیے کہ ان تین احادیث کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش ہے؟ کیا حبل اللہ کا مفہوم قرآن مجید کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے۔ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے بعد میرا یا کسی اور کا، کسے باشد، یہ حق تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حبل اللہ کا کوئی

دوسرا مفہوم بیان کر سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر معین فرمایا کہ حبل اللہ قرآن مجید ہے۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں فارسی میں کہا ہے کہ ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست

یعنی مسلمانوں کی حیاتِ ملّی اور ہیئتِ اجتماعی کا کل دار و مدار قرآن پر ہے جس سے انہیں ایک قانون اور آئین میسر آتا ہے۔ ہم سب یعنی جملہ اعضائے جسدِ ملّی تو خاک کے مانند ہیں، اس جسدِ خاکی میں قلب کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔ پس اے مسلمان اسے مضبوطی سے تھام لے اس لیے کہ حبل اللہ یہی ہے!

پس ایک اور عملی نکتہ یہ ہوا کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا! اللہ کی اس رسّی یعنی قرآن مجید سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ جاؤ ——— عربی میں عصمت کہتے ہیں حفاظت کو ——— اور اعتصام کے معنی ہوں گے اپنی حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ کسی چھوٹے بچے کا تصور کیجئے۔ اگر کسی وقت اُسے کسی طرف سے کوئی اندیشہ ہو، خطرہ ہو، کوئی خوف ہو تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ بے اختیار اپنی ماں کی گود کی طرف لپکتا ہے اور اس کے سینہ سے چمٹ جاتا ہے۔ اس کے ذہن کی جو چھوٹی سی دنیا ہے اور اس کا جو چھوٹا سا پیمانہ ہے اس کے مطابق ماں کے سینہ سے چمٹ کر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں قلعہ میں آگیا ہوں۔ اب مجھے پوری حفاظت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ کوئی شقی القلب انسان بچے کو ماں کی گود سے چھینے، اس کو اچھالے اور نیزے کی انّی میں پرو دے، جیسا کہ قیامِ پاکستان کے فسادات کے وقت اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے سانحہ کے موقع پر عملاً ہو چکا ہے ——— بہرحال اعتصام کا مفہوم ہے حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ چنانچہ فرمایا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اس قرآن مجید کو، اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اس کے ساتھ مِل جُل کر چمٹ جاؤ یا پورے کے پورے قرآن

کو تھامو، ادھورے کو نہیں۔ ادھورے کو تھامو گے تو وہی بات ہو جائے گی جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں یعنی "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ"—— "کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے!"—— 'جمیعًا' کے لفظ میں یہ دونوں مفاہیم شامل ہیں کہ مل جل کر قرآن کو تھامو، اس سے چمٹ جاؤ اور یہ کہ پورے کے پورے قرآن کو تھامو، اس کے ایک حصے اور جزو کو نہیں۔ اسی کو مؤکد کیا گیا یہ فرما کر کہ وَلَا تَفَرَّقُوْا۔ اور اس معاملہ میں تفرقہ میں نہ پڑ جانا۔

اس کے بعد اس دور سے جس میں قرآن مجید نازل ہو رہا تھا ایک تاریخی گواہی پیش کی گئی۔ ارشاد فرمایا: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ "(اے مسلمانو) اور یاد کرو اللہ کا اپنے اوپر احسان اور نعمت"—— خطاب کن لوگوں سے ہے اسے ذہن میں رکھیے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے مخاطب ہیں مہاجرین اور انصار—— اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً "جب تم آپس میں دشمن تھے"۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ "پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی"۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ "پس اللہ کے انعام واکرام سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے"—— مدینہ کے دو قبیلوں اوس اور خزرج میں بڑی پرانی دشمنی تھی جس کے نتیجے میں اسلام سے قبل ان میں بڑی خونی جنگیں ہوتی رہی تھیں۔ علاوہ ازیں عرب میں دوسرے قبائل میں بھی بات بات پر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ الغرض پورے عرب میں بدامنی تھی۔ صرف قریش کو امن حاصل تھا وہ بھی خانہ کعبہ کی بدولت، چونکہ وہ اس کے متولی تھے۔ ورنہ پورے عرب میں خانہ جنگی تھی۔ لوٹ مار، غارت گری اور بدامنی کا بازار گرم تھا۔ اوس اور خزرج کی جس دشمنی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ایک سو سال سے چلی آ رہی تھی اور یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کی عداوت اور خانہ جنگی کی وجہ سے ختم ہو رہے تھے—— فرمایا کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تشریف لائے۔ اس قرآن نے تمہیں آپس میں جوڑا، تمہیں بنیانِ مرصوص بنا دیا۔ ورنہ تمہاری کیفیت اور حالت تو یہ تھی: "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" "اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے تک جا پہنچے تھے"۔ اس میں گر کر تباہ ہو جانے والے تھے۔ "فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا" "تو اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا"۔ بلکہ اس کی ترجمانی یہ ہو گی کہ گویا آگ کے اس گڑھے

سے نکال لیا۔ تم آدھے گر چکے تھے۔ اس نے تمہارا دامن پکڑ کر تمہیں کھینچ لیا۔ اس آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: "كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" یعنی "اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو"۔

آگے بڑھنے سے پہلے اگر ہم اس آیۂ مبارکہ میں بیان شدہ تاریخی واقعہ کے حوالے سے ملتِ اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے لیں تو ایک جانب تو یہ حقیقت مزید مبرہن ہو گی کہ قرآن اللہ کا ابدی اور سرمدی کلام ہے جو اگرچہ نازل تو اب سے چودہ سو برس قبل ہوا تھا لیکن اس کی ہدایت و رہنمائی ہمیشہ کے لیے ہے۔ دوسری جانب ہمیں اس آئینۂ قرآنی میں اپنے موجودہ حالات کی سنگینی کا بھی کماحقہٗ اندازہ ہو سکے گا ——— مزید برآں اس امید کی کرن بھی چمکے گی کہ جس طرح اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اُس وقت کی عرب قوم کی کایا پلٹ دی تھی اسی طرح ہمارے حالات میں بھی انقلاب آسکتا ہے بشرطیکہ ہم اس سہ نکاتی لائحہ عمل کو بالفعل اختیار کر لیں جو اِن آیاتِ مبارکہ میں سامنے آرہا ہے!

کون نہیں جانتا کہ پاکستان کا قیام دو قومی نظریئے کا مرہونِ منت تھا، جس کی رُو سے پُورے برعظیم ہند و پاک کے مسلمان ایک قوم تھے ——— گزشتہ چالیس برس میں بجائے اس کے کہ اِس قوم میں اتحاد و یگانگت کا رنگ گہرا ہوتا اور پاکستان کے مسلمانوں کی یکجہتی پورے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے اتحاد کا پیش خیمہ بنتی، صورتِ واقعہ یہ ہے کہ خود پاکستان میں مسلمان قوم کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی جگہ متعدد نسلی، لسانی اور صوبائی قومیتوں نے لے لی ہے اور صرف تشتّت و انتشار ہی نہیں، باضابطہ قتل و خونریزی اور لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم ہے۔

اِن حالات میں کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہمارے دشمن دائیں بائیں گِدھوں کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ اِس لیے کہ خواہ ہم خود تو حال مست یا مال مست رہیں لیکن اغیار کو تو نظر آرہا ہے کہ ع "یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری"!

اِن حالات میں آدمی اپنے کاروبار میں اور اپنے ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ میں مطمئن اور بےخبر ہو کر اور پاؤں پھیلا کر مگن رہے اور حال اس شعر کے مصداق ہو جائے کہ "اب تو آرام سے گزرتی ہے ——— عاقبت کی خبر خدا جانے" ——— تو اس طرح وہ خطرات تو نہیں ٹل سکتے جو ہمارے

سروں پر منڈلا رہے ہیں اور ــــــ اگر ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اس سے خطرہ تو ٹل نہیں جاتا۔ اگر ہمارے یہی لچھن رہے کہ "اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" (الانشقاق: ۱۳) ہم اپنے اہل وعیال، اپنے کاروبار، اپنے عیش وآرام ہی میں مگن رہیں تو دوسری بات ہے لیکن اگر حالات کو چشم بصیرت سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس آیتِ مبارکہ کے یہ الفاظ ہماری موجودہ کیفیات پر بالکل منطبق ہو رہے ہیں کہ: "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ"۔ اس لیے کہ جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے قرآن مجید ہمارے لیے ابدی رہنمائی لے کر آیا ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم میں تدبر کے نتیجہ میں ہر قسم کے حالات، کیفیات اور واقعات کے لیے ہمارے سامنے عملی رہنمائی آجاتی ہے۔ جیسے ہم ختمِ قرآن کی دعا میں کہتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّ نُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً "اے اللہ اس قرآن کو ہمارا امام بنا دے، اسے ہمارے لیے نور بنا دے، اسے ہمارے لیے رہنمائی بنا دے، اسے ہمارے لیے رحمت بنا دے"۔ لیکن یہ صرف کہنے سے تو نہیں ہوگا۔ اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا، اس قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا۔ یہ ہے اس لائحہ عمل کا دوسرا نکتہ جو ان آیاتِ مبارکہ کے مطالعہ کے حاصل کے طور پر ہمارے سامنے آیا ہے۔

گویا ــــ پہلا نکتہ ہے تقویٰ اور اسلام۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا۔ طبعاً اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے بچنا بھی شامل ہے، چونکہ رسول کے احکام درحقیقت اللہ ہی کے احکام ہوتے ہیں اور رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ بمصداق ارشاداتِ ربانیہ: "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" (النساء: ۸۰) اور "وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (النساء: ۶۴) اور "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" (النساء: ۵۹) اور اسلام سے مراد ہے فرماں برداری۔ پوری زندگی میں اور ہر لمحہ، ہر لحظہ: وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ!

اور ــــ دوسرا نکتہ ہے: اعتصام بالقرآن ــــ "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا"۔ پورے قرآن کو مل جل کر مضبوطی سے تھامنا اور اس کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑنا۔ رہی یہ بات کہ 'اعتصام بالقرآن' سے مراد کیا ہے تو الحمد للہ اس موضوع پر راقم کا

ایک کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"، لاکھوں کی تعداد میں اردو، انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی میں طبع ہو کر کم از کم عالمِ اسلام کے طول و عرض میں پھیل چکا ہے جس کا لبِّ لباب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پر اپنے ایمان اور یقین کو مزید گہرا اور پختہ کرے۔ دوسرے[۲] یہ کہ اس کی تلاوت کرے جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ تیسرے[۳] یہ کہ اس کو سمجھے اور اس پر غور و فکر کرے جیسے کہ اس پر تدبّر کا حق ہے۔ چوتھے[۴] یہ کہ اس پر عمل کرے، اپنی انفرادی زندگی میں فی الفور اور اس کے عطا کردہ قانون و آئین کے نفاذ اور نظامِ عدل و قسط کے قیام کی اجتماعی جدّوجہد میں بھرپور حصہ لے کر، اور پانچویں[۵] یہ کہ اس کو دوسروں تک پہنچائے اور اس کے لیے بہترین مساعی کو بروئے کار لائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اس طور پر قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید کر لیں تو اس سے ان کے اندر ذہنی و جذباتی ہم آہنگی اور مقصد اور نصب العین کی یکجہتی پیدا ہو گی جس سے تشتّت و انتشار کی موجودہ کیفیت کافور ہو جائے گی اور مسلمان از سرِ نو بنیانِ مرصوص بن جائیں گے — اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا کہ "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ" (مسلم عن عمرؓ) یعنی "اللہ اس قرآن کا دامن تھامنے کے باعث قوموں کو سربلندی عطا فرمائے گا اور اس کو پسِ پشت ڈالنے والی قوموں کو ذلیل و خوار کرے گا" جس کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے اپنے الہامی اشعار میں کی ہے کہ ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

— یعنی اے امّتِ مسلمہ درحقیقت تو قرآن سے دوری کے باعث ذلیل و خوار ہوتی ہے۔ اس ضمن میں گردشِ دوراں کا شکوہ بے بنیاد ہے — اور اے وہ قوم جو زمین پر شبنم کے مانند

گری ہوتی ہے (جسے اغیار پامال کر رہے ہیں) تیری بغل میں اب بھی زندہ کتاب یعنی قرآن مجید موجود ہے۔

الغرض یہ ہیں وہ دو نکات جن پر عمل پیرا ہونے سے ایک انسان انفرادی طور پر ایک بندۂ مومن بنتا ہے اور پھر ان افراد کے مجموعے سے ایک مضبوط اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس اجتماعیت کے لیے لائحہ عمل کون سا ہے؟ تو اس کا بیان اگلی آیت میں آرہا ہے اور حسن اتفاق سے یہ اجتماعی لائحہ عمل بھی تین نکات ہی پر مشتمل ہے۔

نکتۂ سوم: اجتماعی لائحہ عمل

اب تیسری آیت پر اپنی توجہات کو پوری طرح مرکوز فرمائیے۔ آیت مبارکہ ہے:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝

اس آیت مبارکہ پر غور و فکر کرنے سے قبل بطور مقدمہ ایک اہم بات ذہن نشین فرمالیں۔ ہم نے اب تک ان دو آیات کا مطالعہ کیا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ..... الخ۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ یہاں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ایک اجتماعیت کی متقاضی ہیں اور ان پر اگر خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ واقعۃً عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں لازماً ایک "اجتماعیت" وجود میں آتی ہے۔ اب آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اجتماعیت کس مقصد کے لیے درکار ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ کوئی چھوٹی سی انجمن بناتے ہیں تو اس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا غور طلب بات یہ ہے کہ "حبل اللہ" سے جڑ کر جو جمعیت وجود میں آئے گی اس کا مقصد کیا ہوگا؟

یہ ہے وہ بات جس کی اس آیت میں وضاحت فرمائی گئی کہ : وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِؕ
اِس آیت کے دو ترجمے کیے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہاں "مِنۡ" بیانیہ ہے اور بعض کے نزدیک تبعیضیہ ہے۔ یہ دونوں لغوی اصطلاحات ہیں۔ اِن پر فنی بحث کی بجائے اِن سے ترجمہ میں جو فرق واقع ہوتا ہے اسے سمجھنا چاہیے۔ مقدم الذکر تاویل کے اعتبار سے ترجمہ یہ ہوگا "تم سے ایک ایسی امّت وجود میں آنی چاہیے۔" اور اگر یہاں مِنۡ کو تبعیضیہ سمجھا جائے تو ترجمہ ہوگا "تم میں سے ایک ایسی امّت بھی وجود میں آنی چاہیے۔" میرے نزدیک یہ دونوں ترجمے صد فیصد درست ہیں۔ مسلمانوں میں اشتراک و اتحاد ہو اور وہ سب مل کر ایک امّت بن جائیں جن کا کام کیا ہو — يَدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ۔
یہ تو ہو جائے گی اس ترجمہ کی وضاحت کہ "تم سے ایک ایسی امّت وجود میں آنی چاہیے جو یہ کام کرے۔" لیکن چونکہ اس مضمون کی آیت اسی سورۃ آل عمران میں آگے موجود ہے : كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ "تم سب اُمّتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں کے لیے بھیجی گئیں۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔" لہٰذا اکثر مفسّرین کی رائے میں یہاں 'مِنۡ' بیانیہ نہیں بلکہ تبعیضیہ ہے۔ یعنی اگر صورتِ حال یہ ہو جائے کہ پُوری امّت سو گئی ہو، پُوری امّت کو اپنی ذمّہ داریوں کا احساس نہ رہا ہو، پُوری اُمّت اپنے فرضِ منصبی کو فراموش کر چکی ہو تو اس صورت میں کیا ہونا چاہیے۔

آگے بڑھنے سے قبل بطور جملہ معترضہ ایک بات عرض کرنی ہے۔ بات اگرچہ تلخ ہے لیکن ہے امرِ واقعہ ! اور وہ یہ کہ اگرچہ نظری طور پر ہم دنیا کے تمام مسلمانوں پر 'امّتِ مسلمہ' کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت کوئی ایک 'امّتِ مسلمہ' اس وقت دنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ فی الواقع یہاں بے شمار قومیں ہیں جن کو مسلم اقوام (MUSLIM NATIONS) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ علّامہ اقبال کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اِس صدی میں وحدتِ مِلّی کا ان سے بڑا حدی خواں کوئی نہیں تھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا   مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

اور

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے   نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

لیکن اِس صدی کے وحدتِ ملّی کے سب سے بڑے حدی خواں یعنی علّامہ اقبال کو بھی اپنے لیکچرز "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اِس وقت دنیا میں کوئی اُمّتِ مسلمہ ایک اکائی اور اتحاد کے اعتبار سے موجود نہیں ہے ـــــ بلکہ حقیقی یعنی DE-FACTO پوزیشن یہ ہے کہ "مسلمان اقوام" (MUSLIM NATIONS) موجود ہیں اور یہ بھی آج سے نصف صدی سے پہلے کی بات تھی۔ اغلباً علّامہ کے لیکچرز ۱۹۳۰ء کے ہیں۔ اب تو صورتِ حال مزید خراب ہو کر نوبت بایں جا رسید کہ کسی مسلمان ملک میں ایک "قوم" (NATION) نہیں رہی بلکہ وہ بھی کئی قومیتوں کے اندر منقسم ہے۔ دنیا میں پاکستانی ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ صوبوں کی بنیاد پر یہاں پانچ قومیتوں کے تصوّر کو شروع ہی سے اُبھارا جاتا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان بنگلہ قومیت کی بنیاد پر بنگلہ دیش بن گیا اور غیر بنگالی مسلمانوں کو وہاں تہ تیغ کیا گیا۔ پھر اِس موجودہ پاکستان میں کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس کے اندر صرف ایک قوم آباد ہے۔ کیا بلوچستان میں جہاں بلوچ ہیں وہاں بروہی نہیں ہیں! کیا وہاں پٹھان موجود نہیں ہیں، کم از کم تین بڑی قومیں اس ایک صوبے کے اندر بستی ہیں۔ یہی معاملہ پاکستان کے بقیہ صوبوں کا ہے ـــــ! اور تو اور ایک عربی زبان بولنے والے عرب نہ معلوم کتنی قومیتوں میں منقسم ہیں ـــــ تو حقیقت یہی ہے اگرچہ بڑی تلخ ہے کہ آج "ایک اُمّتِ مسلمہ" بالفعل موجود نہیں ہے۔ وہ تو ہمارا صرف ایک ذہنی تصوّر ہے کہ اُمّتِ مسلمہ یا اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام فی الواقع اپنا وجود رکھتی ہے اور اِس ذہنی تصوّر کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ جو بھی حضورؐ کا کلمہ پڑھتا ہے وہ حضورؐ کا اُمّتی ہے! یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن غور کیجئے کہ کیا یہ اُمّت مربوط ہے؟ کیا اس کی کوئی اجتماعیت ہے؟ کیا اِس میں کوئی ڈسپلن ہے؟ کیا اس میں کوئی کسی کا حکم سننے اور ماننے والا ہے؟ مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ایسی صورتِ حال موجود نہیں ہے۔ آج افغانستان میں روسی فوج افغانوں کا قتلِ عام کر رہی ہے۔ لیکن کیا روسی فوج کے ساتھ افغان فوج نہیں ہے! کیا وہ اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگ رہی اور

اپنے ہاتھوں اپنے بھائیوں کے گلے نہیں کاٹ رہی! ایران اور عراق کی جو جنگ ہو رہی ہے کیا یہ مسلمان کہلانے والے دو ملکوں کی جنگ نہیں! ستم یہ ہے کہ عراق کی قریباً نصف آبادی اہلِ تشیّع پر مشتمل ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایران کی غالب اور عظیم ترین اکثریت اہلِ تشیّع ہی کی ہے۔ لہٰذا مذہبی اعتبار سے عراق کی نصف کے قریب آبادی ایران کی ہم مذہب ہے۔ لیکن سات سال ہونے کو آئے اور یہ جنگ تاحال جاری ہے اور دونوں اطراف سے شدید مالی وجانی نقصان ہو رہا ہے۔ دوسرے مسلم ممالک کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں جو اس جنگ کو بند کرانے کے لیے کی جا رہی ہیں[۱]۔ سُنیوں اور شیعوں کا جو مسلّح خونیں تصادم لبنان میں ہوا وہ کسی اخبار بین شخص سے پوشیدہ نہیں ہے! وہ مظالم جو کبھی عیسائی ملیشیا نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے، وہی مظالم شیعہ ملیشیا نے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں پر ڈھائے ہیں۔

یہ تمام ہنگامے بتا رہے ہیں کہ ایک اُمّتِ مسلمہ بالفعل کہیں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ان حالات میں یہ آیت خوب سمجھ میں آتی ہے کہ جب پوری امّت سوئی ہوئی ہو، یا مختلف قومیتوں میں بٹی ہوئی ہو یا اس نے مختلف سمتوں کی طرف اپنے اپنے قبلے بنا لیے ہوں تو ایسی صورت میں اس امّت کے اندر کوئی چھوٹی امّت لازماً ایسی وجود میں آنی چاہیے جو اس قرآنی ہدایت پر عمل پیرا ہو جو آیۂ زیرِ بحث میں بیان کی گئی ہے۔ وہ ہدایت کیا ہے؟ اس پر گفتگو ذرا آگے چل کر ہوگی۔ ہو سکتا ہے یہاں بعض لوگ چونکیں کہ یہ بڑی امّت کے دائرے کے اندر "چھوٹی امّت" کا کیا تصور ہے، آپ نے ریاست میں ریاست (STATE WITHIN STATE) یا PARTY WITHIN PARTY کی اصطلاح ضرور سنی ہوگی۔ جو لوگ میری عمر کے ہیں یا مجھ سے بڑے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ کانگریس ایک بہت بڑی پارٹی تھی لیکن اس کا فارورڈ بلاک (FORWARD BLOCK) علیحدہ تھا، جو زیادہ انقلابی طرزِ فکر کے حامل لوگوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے کانگریس میں شامل ہونے کے باوجود سبھاش چندر بوس کی قیادت میں اپنا جداگانہ بلاک بنا رکھا تھا۔ اسی طرح آج جو امّتِ مسلمہ ہے وہ محض ایک نظری حقیقت بن کر رہ گئی ہے، جس کی کوئی واقعاتی حقیقت نہیں ہے۔ تو اس بڑی امّت میں ایک چھوٹی امّت ایسے لوگوں پر مشتمل وجود میں آئے جنہوں نے کسی نہ کسی درجہ

---

[۱] واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۸۵ء کی ہے۔

میں اس سیڑھی پر قدم رکھا ہو جس کا حکم پہلی آیت میں آیا تھا۔ یعنی وہ لوگ دولتِ تقویٰ سے مالا مال ہوں ــــــ میں پھر عرض کر دوں کہ تکمیل کا کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ جو کمی ہو اسے پُورا کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہوں ــــــ اور پھر یہ کہ انہوں نے دوسری آیت کا تقاضا بھی کسی قدر پورا کیا ہو یعنی انہوں نے اپنے آپ کو قرآن سے منسلک کر لیا ہو۔ اس طرح وہ باہم ایک دوسرے سے مل کر ایک اجتماعی طاقت وجود میں لائیں۔ اس اجتماعیت کا مقصد کیا ہو؟ اس کے لیے یہاں تین چیزوں کا تعیّن کیا گیا!

پہلا مقصد "یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ" یعنی دعوت الی الخیر ــــــ نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلانا۔

دوسرا مقصد ــــــ نیکی اور بھلائی کا حکم "وَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ" ــــــ

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیر کی دعوت اور خیر کا حکم! کیا یہ ایک ہی چیز ہے جس کا اعادہ کیا جا رہا ہے! معاذ اللہ، قرآن مجید میں کسی ایک ہی مقام پر اس طرح کا اعادہ جو تکرارِ محض کے ضمن میں آئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں "دعوت الی الخیر" اور "امر بالمعروف" کے مصداق کا الگ الگ تعیّن کرنا ہو گا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد قرآن کی طرف دعوت ہے۔ چونکہ قرآن کی رُو سے سب سے بڑا خیر خود قرآن مجید ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ یونس کی آیات ۵۷ اور ۵۸ میں قرآن مجید نے نہایت پرشکوہ اسلوب سے اپنی عظمت کو بیان کیا ہے۔ مؤخر الذکر آیت کے آخر میں قرآن اپنے متعلق کہتا ہے: "هُوَخَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ" یعنی "یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں وہ (قرآن) ان سب سے بہتر ہے"۔ قرآن مجید دنیوی دولت کو بھی خیر کہتا ہے مثلاً سورۃ العادیات میں فرمایا: "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ" یعنی "انسان مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے"۔ لیکن سورۂ یونس میں قرآن اپنے لیے کہتا ہے کہ جو کچھ بھی تم دنیوی مال و اسباب جمع کرتے ہو ان سب سے کہیں قیمتی شے خود قرآن ہے۔ "هُوَخَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ" یہاں دعوت الی الخیر سے مراد ہے قرآن مجید کی طرف دعوت! ــــــ اور امر بالمعروف اب عام ہو جائے گا۔ نیکی، بھلائی، خیر کی تلقین کرنا، اس کی وضاحت کرنا، اس کا مشورہ دینا، اس کا حکم دینا "امر" کے لفظ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ پہلا امکان اور فرق تو یہ ہے۔

'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف' کے مصداقات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ دعوت میں تحکمانہ انداز بالکل نہیں ہوتا۔ دعوت میں صرف تلقین ہوتی ہے نصیحت ہوتی ہے بلکہ خوشامد بھی ہوتی ہے کہ خدا کے لیے یہ کام بُرا ہے اسے چھوڑ دیجئے اور بھائی یہ کام اچھا ہے، آئیے اور اس کو کیجئے۔ اس انداز اور طریقہ سے آپ لوگوں کو بلاتے ہیں کہ اگر آپ یہ کام کریں گے تو آپ کو آخرت میں یہ اجر و ثواب ملے گا۔ دعوت کا درحقیقت یہی انداز ہوتا ہے۔ اس میں تحکمانہ انداز نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا یہاں علیحدہ کر دیا گیا: "یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ" خیر کی طرف بلاؤ، بڑی نرمی سے بلاؤ، خیر خواہی کے جذبہ سے بلاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علی نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) سے فرمایا گیا تھا: "اِذْهَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی" ۝ دونوں جلیل القدر پیغمبروں کو حکم دیا گیا کہ "فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے" فرعون کون ہے! دشمن خدا اور خود خدائی کا مدعی۔ مگر حکم دیا جا رہا ہے کہ "لیکن اس سے نرم انداز سے بات کرنا (سختی کا انداز اختیار نہ کرنا) شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اس کے دل میں بات اتر ہی جائے" (سورۃ طٰہٰ: ۴۳-۴۴) ——— تو یہ ہے دعوت کا انداز لیکن اس سے آگے کا قدم ہے "امر بالمعروف" یعنی نیکی کا حکم دینا ——— غور کیجئے کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے کب وارد ہوئی! سورۃ الحج میں جب اہل ایمان کو تمکن فی الارض کی نوید سنائی گئی:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ۴۱)

یعنی "یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اگر ہم زمین میں تمکن عطا کر دیں (اقتدار بخش دیں) تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے" ——— یہاں تحکم کا انداز ہے۔ نیکی کو قوت اور طاقت کے ساتھ رائج کرنا، نافذ کرنا ——— یہ ہے درصل دعوت سے اگلا قدم!

اب تیسری بات پر آئیے جو بدقسمتی سے ہمارے بہت سے نیک لوگوں کے ذہن سے بھی آج بالکل خارج ہو چکی ہے۔ وہ بات ہے: "نہی عن المنکر" یعنی بدی سے روکنا ——— ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس بھلائی کی تلقین سے کام چل جائے گا۔ صرف نیکی کا وعظ کہنے سے بات

بن جائے گی۔ حالانکہ میں قرآن مجید کے کم از کم نو ایسے مقامات کا حوالہ دے سکتا ہوں جہاں گاڑی کے دو پہیوں کی طرح یہ دونوں اصطلاحات بالکل ساتھ ساتھ اور جوڑے کی شکل میں آئی ہیں مثلاً: "وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو۔ (لقمان: ۱۷) بدی سے روکنا کتنا اہم ہے اس کو دو حدیثوں سے سمجھیے۔ میں وقت کی کمی کے باعث صرف مختصر تشریح پر اکتفا کروں گا ——— یہ دونوں مسلم شریف کی روایات ہیں، صحیح مسلم کا کتب احادیث میں کیا مقام ہے! اسے بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا مجھے یقین ہے کہ تمام ذی شعور مسلمان صحیح مسلم کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف ہوں گے ———

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مجھے توقع ہے کہ یہ حدیث آپ میں سے اکثر نے سنی ہو گی۔ لہٰذا اس کا تو صرف متن کے ساتھ ترجمہ کر دوں گا لیکن دوسری حدیث اس قدر زیادہ عام نہیں ہے، حالانکہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ اور فقہ حنفی در اصل فقہ عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہے، اس لیے کہ امام ابو حنیفہؒ دو واسطوں سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں۔ لہٰذا درحقیقت انہی کی فقہی آرا ہیں کہ جنہوں نے فقہ حنفی کی شکل اختیار کی۔

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابو سعید الخدریؓ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ" "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اُس پر لازم ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے یعنی طاقت سے بدل ڈالے۔" "وان لم یستطع فبلسانہ" "و لیکن اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو (اس کے پاس قوت و طاقت نہ ہو) تو اسے زبان سے روکے"، اس کی مذمت کرے، اس پر تنقید کرے گویا "زبان سے اُسے بدلنے کی کوشش کرے۔" "وان لم یستطع فبقلبہ" "اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو" یعنی زبانوں پر بھی قدغنیں لگا دی گئی ہوں، زبانوں پر بھی پہرے ہوں تو "فبقلبہ" "پھر اپنے دل سے" یعنی کم سے کم دل میں ایک گھٹن تو محسوس کرے، قلب میں ایک کرب، صدمہ اور رنج کی کیفیت تو ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آخری کیفیت کے بارے میں فرمایا: "وذٰلک اضعف الایمان" "یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

اب میں آپ سے اس حدیث پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ دیکھیے! اس میں

پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ اس میں 'امر بالمعروف' کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔ سارا زور 'نہی عن المنکر' پر ہے۔ ایک اسلامی نظامِ حکومت کا فرض ہے کہ قوّت وطاقت کے ساتھ منکرات کو روک دے۔ لیکن اگر اسلامی نظامِ حکومت قائم نہیں ہے اور منکرات کو فروغ ہو رہا ہے تو بندۂ مومن پر واجب ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ حق کی بات کہے، منکرات کے خلاف تنقید کرے، زبان وقلم سے اِن منکرات کو بدلنے کی سعی کرے۔ لیکن ایک شخص کمزور ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے منکرات کے خلاف آواز اٹھائی، زبان کھولی تو اوّل تو معاشرہ ہی میرا استہزا کرے گا، مذاق اُڑے گا پھر ہو سکتا ہے کہ حکومت وقت مجھے اس پر قید کر کے جیل میں ٹھونس دے۔ لٰہذا وہ زبان سے کچھ کہنے کی ہمّت نہیں پاتا۔ لیکن وہ ان منکرات کے خلاف دل میں چبھن اور گھٹن محسوس کرتا ہے، اِن منکرات پر کڑھتا ہے تب بھی حضورؐ کے ارشاد کے بموجب اس کے دل میں ایمان ہے تو سہی لیکن ہے کمزور ترین ایمان۔ 'اضعف'، افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ یعنی ایمان کی کمزوری اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کی دوسری روایت کے آخری حصّہ میں "وذلك اضعف الایمان" کے بجائے یہ الفاظ آئے ہیں کہ: "ولیس وراء ذٰلك من الایمان حبة خردل" یعنی اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے ——— البتہ یہ تینوں کیفیتیں ایسی نہیں ہیں کہ جن کے لیے خارج میں آپ کوئی ضابطہ بنا سکیں بلکہ اس کا سارا معاملہ انسان کے اپنے ایمان ویقین پر ہے۔ اس کے اندر کتنا یقین (CONVICTION) ہے۔ اس کے اندر دین کے لیے کتنی غیرت اور حمیّت ہے! اس کا دارومدار اس پر ہے۔ اس لیے کہ کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے اور وہ چُپ کھڑا رہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل غمازی کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے اندر جرأت وہمّت نہیں ہے بلکہ غیرت وحمیّت کا بھی فقدان ہے ——— لیکن کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے تو اگر اس میں ہمت نہیں ہے، مگر غیرت وحمیت موجود ہے تو کم از کم یہ لازماً ہو کر رہے گا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آجائے گا۔ وہ کچھ اور نہیں کر سکے گا تو اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپنے لگے گا اور لرزے گا اور دل ہی دل میں انتہائی کرب، صدمہ اور رنج محسوس کرے گا۔ غیرت وحمیّت کا کم سے کم تقاضا یہ تو ہر

ایک تسلیم کرے گا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جائے، وہ تھرتھراتے اور دل میں کرب و اضطراب محسوس کرے اور اگر اس میں کوئی دم بھی ہے، طاقت بھی ہے تو وہ اس شخص کو یونہی جانے نہیں دیگا جس نے اسے ماں کی گالی دی ہے۔

اس مثال سے آپ اس بات کو سمجھئے کہ جن میں اللہ کے دین کی زیادہ غیرت و حمیّت ہوگی، وہ اپنی کمزوری کے باوجود ڈٹ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیلوں میں ٹھونس دیئے جائیں گے یا پھر یہ کہ لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑے گی۔ یا آخری درجہ میں جان کا نذرانہ دینا پڑے گا۔ اس زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں کھپا دیا جائے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

حدیث کا آخری ٹکڑا "وذٰلك اضعف الایمان" یہ بتا رہا ہے کہ اصل مطلوب اور غیرت و حمیّتِ دینی کا تقاضا یہ ہے کہ بدی کے خلاف طاقت فراہم کی جائے اور اس کا استیصال کیا جائے۔

اب دوسری حدیث کی طرف آیئے۔ یہاں اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور زیادہ نکھار کر بیان کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ——— وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما من نبیٍّ بعثہ اللہ فی امۃ قبلی" ——— یعنی "مجھ سے پہلے اللہ نے جس اُمّت میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا" "اِلَّا کان لہ فی اُمّتہٖ حواریّون و اَصحابٌ" "تو اس کی اُمّت میں اس کے حواری اور اصحاب ہوتے تھے" ——— حواری کا لفظ خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھیوں کے لیے آتا ہے جیسے: "قال الحواریون نحن انصار اللہ"۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے صحابہ یا اصحاب کا لفظ آتا ہے۔ حضورؐ نے یہاں دونوں الفاظ یعنی حواریوں اور اصحاب کو جمع کر لیا ——— وہ کیا کرتے تھے؟ "یأخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ" "وہ اپنے نبی کی سنّت کو مضبوطی سے تھامے رکھتے تھے اور نبی علیہ السلام کا جو بھی حکم ہوتا تھا اس کی پیروی کرتے تھے" ——— "ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف" ——— "پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آتے تھے جو نالائق

اور ناخلف ہوتے تھے"۔ گویا ایک دو یا تین نسل تک تو معاملہ بڑی حد تک ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ میں نے ایک دو نسل کیوں کہا! یہ بھی حضورؐ کی ایک حدیث میں آیا ہے" خیر اُمتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" یعنی میری اُمّت کا بہترین دَور میرا دَور ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحاب سے ملیں گے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحاب سے ملنے والوں سے ملیں گے۔ ان ادوار کو ہم" قرون مشھود لھا بالخیر" کہتے ہیں گویا حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا زمانہ بہترین ہے۔ پھر دوسرے نمبر پر تابعین کا زمانہ ہے اور اس کے بعد درجہ ہے تبع تابعین کے عہد کا! ــــــ اب پھر حدیث زیرِ بحث کی طرف رجوع کیجئے، فرمایا:" ثم اِنّھا تخلف من بعد ھم خلوفٌ" ایک ایک لفظ پر غور کیجئے ـــــ حضورؐ نے فرمایا" ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آجاتے تھے جو ناخلف اور نالائق ہوتے تھے" " یقولون مالا یفعلون "" وہ کہتے تھے جو کچھ کرتے نہیں تھے"۔ "ویفعلون مالا یؤمرون"۔" اور کرتے وہ کام تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا" ــــ یہاں اشارہ بدعات کی طرف ہے گویا دین میں نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی گئی ہیں، نئے نئے طریقے اختراع کر لیے گئے ہیں۔ یہ اصول پیشِ نظر رکھیے کہ جو بدعت بھی آئے گی وہ کسی نہ کسی سُنّت کو ہٹا کر اس کی جگہ لے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بدعت آئے اور سُنّت رخصت نہ ہو ــــــ ان ناخلف اور نالائق جانشینوں کے متعلق حضورؐ نے بڑا خوبصورت اور جامع پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔ "یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون" ــــ آگے بڑھنے سے قبل پہلے تو یہ غور کیجئے کہ ہم کس دَور میں ہیں! آیا ہم اُس دَور میں بس رہے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا یا اُس میں جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ اب تو پندرہویں صدی ہجری شروع ہو چکی ہے۔ جبکہ دَورِ صحابہؓ کے بعد چوتھی ہی نسل سے بالکل ابتدائی درجے میں وہ بات شروع ہو چکی تھی ــــ جس کے متعلق مشہور تبع تابعی، محدّث اور اپنے دَور کے عالم باعمل اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنے اس شعر میں رہنمائی کی ہے:

وما افسد الدین اِلاّ الملوک   واحبارُ سوءٍ ورھبانُھا

یعنی دین میں جو خرابی بھی آتی ہے وہ تین اطراف سے آتی ہے ــــ بادشاہوں کی طرف سے۔

علماءِ سوء یعنی بُرے علماء کی طرف سے اور بُرے صوفیوں کی طرف سے! ایک تو علماءِ حقانی ہیں جو واقعی اللہ کے دین کو عام کرتے ہیں۔ اس پر خود بھی چلتے ہیں اور لوگوں کو بھی چلاتے ہیں ۔ ایک وہ اللہ والے صوفیاء ہیں جو اللہ ہی کے راستے پر چلنے اور چلانے والے ہیں لیکن اس بازار میں تو ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ جہاں علماءِ حقانی ہیں وہاں علماءِ سوء بھی ہیں۔ جہاں دین و شریعت پر عامل صوفیاء ہیں وہاں دنیادار اور ظاہردار صوفی بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تشخیص کے مطابق دین میں خرابی ان تین اطراف سے آتی ہے اور انہوں نے ان خرابیوں کا بنفسِ نفیس کسی قدر مشاہدہ کیا ہوگا جب ہی تو یہ تشخیص کی تھی۔ تو اندازہ کیجئے کہ ہم تو پندرہویں صدی میں بیٹھے ہیں تو خرابیوں کے اعتبار سے ہم کس مقام پر ہیں! ـــــــ آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن" "جو کوئی ایسے ناخلف لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے پس وہ مؤمن ہے" "ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن" "اور جو ایسے لوگوں سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے پس وہ مؤمن ہے" "ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن" "اور جو ایسے نالائقوں کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا یعنی ان کے افعال پر اپنے دل میں کرب اور صدمہ محسوس کرے گا اور مضطرب اور بے چین رہے گا پس وہ بھی مؤمن ہے" ـــــــ اور آخر میں حضورؐ نے فرمایا: "ولیس وراء ذٰلک من الایمان حبۃ خردل" "اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے" حضورؐ کے اس ارشاد کے آخری حصے پر غور کیجئے! یہ لرزہ طاری کر دینے والی وعید ہے۔ اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے تو "الصادق والمصدوق" شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کے ایمان کی نفی فرما رہے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہاں حقیقی ایمان کی نفی مراد ہے قانونی طور پر نفی نہیں ہے اور یہ دل کا معاملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دل اور نیت کے معاملات کے متعلق اس دنیا میں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ فیصلہ تو اُخروی عدالت میں ہوگا، جس کے متعلق سورۃ التغابن میں فرمایا: "ذٰلک یوم التغابن" یعنی "آخرت کا دن ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن" ـــــــ

اس حدیث شریف کے ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ کیجئے! ـــــــ اس حدیث میں "ھم" کی ضمیر مفعولی انتہائی قابلِ غور ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ناخلف جانشینوں کے خلاف

جہاد کی تاکید فرما رہے ہیں جو مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر منکرات کو فروغ دے رہے ہوں، جن کے طور طریقے منکرات پر مشتمل ہوں، جو ذرائع ابلاغ کو منکرات کی تشہیر و اشاعت کے لیے استعمال کر رہے ہوں، جو ملک بھر میں ایسے تمام اداروں کی دامے، درمے، سخنے سرپرستی کر رہے ہوں، جو منکرات کے فروغ میں دن رات مصروف ہوں۔ جن کی مساعی کی بدولت معروفات معاشرہ میں سسک رہی ہوں اور وہ سنڈاس بن گیا ہو ــــــ ساتھ ہی ان علماء سوء کے اور ان نام نہاد صوفیاء کے خلاف بھی جہاد کی تاکید اس حدیث میں تبعًا موجود ہے جو مسندِ افتاء و ارشاد پر بیٹھے ان منکرات کو دیکھ رہے ہوں اور نہ صرف مہر بلب بلکہ اقتدار وقت کے اعوان و انصار بنے ہوئے ہوں۔

اُمّت کی وحدت اور نصبُ العین

سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۰ میں اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سند عطا فرمائی گئی ہے کہ "تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہو!" ــــــ گویا پوری اُمّت مسلمہ کا مقصدِ وجود ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اور اصلاً مطلوب یہ ہے کہ پوری اُمّت ایک جسدِ واحد کے مانند ہو اور اس کا اجتماعی نصب العین ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بن جاتے، پھر یہ بھی جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جہاں اجتماعیت میں زیادہ سے زیادہ اتحاد و یگانگت سے نصب العین کی جانب پیش قدمی میں مزید شدّت و قوّت پیدا ہوتی ہے، وہاں نصب العین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قلبی و جذباتی وابستگی بجائے خود اجتماعیت کو مزید تقویت و استحکام بخشنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس طرح قدم آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مطلوبہ اور مثالی و معیاری کیفیت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی۔ جیسا کہ خود اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین یا چار نسلوں تک تو یہ کیفیت برقرار رہی لیکن اس کے بعد نصب العین سے وابستگی میں ضعف پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اس کے نتیجے میں اُمّت کی وحدت اور یگانگت میں بھی دراڑیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ تا آنکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُمّتِ واحدہ

کا تصوّر تو صرف ذہنوں میں باقی رہ گیا ہے۔ بالفعل اس وقت دنیا میں ایک امّت مسلمہ کی بجائے بے شمار مسلمان اقوام اور قومیتیں موجود ہیں۔

قرآنِ حکیم چونکہ ایک ابدی ہدایت نامہ ہے، لہٰذا اس نے ایسی صورتِ حال کے لیے بھی پیشگی ہدایت عطا فرما دی تھی جو اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۰۴ میں وارد ہوئی ہے، جس پر تفصیلی گفتگو صفحاتِ گزشتہ میں ہو چکی ہے اور جس کا خلاصہ اور لُبِّ لباب یہ ہے کہ اس منتشر اور خوابیدہ اُمّت میں سے جو لوگ جاگ جائیں اور انہیں اپنے اجتماعی فرائض کا شعور و ادراک حاصل ہو جائے وہ باہم جمع ہوں اور مِل جُل کر اُس خیالی و تصوّراتی اور خوابیدہ و معطّل امّت کے دائرے کے اندر اندر ایک چھوٹی مگر فعّال اور منظّم اُمّت وجود میں لائیں جو اس اجتماعی نصب العین کی جانب پیش قدمی شروع کر دے۔ پھر جیسے جیسے نشانِ منزل نمایاں ہوتا جائے گا زیادہ سے زیادہ لوگ اس قافلے میں شامل ہوتے چلے جائیں گے اور وہ صورت عملاً پیدا ہو جائے گی کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا!

تا آنکہ پُوری اُمّت مسلمہ کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد آ جائے گا اور وہ نقشہ بالفعل نگاہوں کے سامنے آ جائیگا جس کا خواب نصف صدی پیشتر حکیم الامّت علاّمہ اقبال مرحوم و مغفور نے دیکھا تھا، یعنی :

آسماں ہو گا سحر کے نُور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجُود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اب اصلاً تو ہمیں آگے بڑھ کر اس امر پر غور کرنا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نبوی طریقِ کار کیا ہے، اور اس کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکمتِ عملی اختیار فرمائی تھی۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک حکیمانہ قول کے مطابق جسے امام مالکؒ نے زندۂ جاوید

بنادیا اس اُمت کے آخری حصّے کی اصلاح اور تعمیرِ نو صرف اِسی طریق پر ممکن ہے جس پر اس کے پہلے حصّے کی اصلاح ہوئی تھی ——— لیکن اس سے قبل ——— اُمّتِ مسلمہ کے اتحاد کی اہمیّت اور اس کے اجتماعی نصب العین کی وضاحت کے ضمن میں امیرِ تبلیغ مولانا محمّد یوسفؒ کی زندگی کی آخری تقریر سے نہایت اہم اور ایمان افروز اقتباس پیش کیا جاتا ہے تاکہ موضوع کی اہمیت مزید نکھر کر سامنے آجائے اور خاص طور پر یہ امر پوری طرح مبرہن ہوجائے کہ مسلمانوں کے اُمّت ہونے کی اہمیت کیا ہے جس کے لیے مولانا موصوفؒ نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے محاورے کے مطابق 'اُمت پنا' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

واضح رہے کہ مولانا محمّد یوسفؒ سلسلۂ تبلیغ کے بانی اور مؤسس مولانا محمّد الیاسؒ کے فرزندِ ارجمند اور ہر اعتبار سے خلف الرشید تھے اور انہوں نے اپنے والد بزرگوارؒ کے انتقال کے بعد جس طرح ان کے جاری کردہ مشن ہی کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنی قوتوں اور توانائیوں کی آخری رمق تک وقف کر دی تھی، وہ بہت سے دین کے خادموں اور ان کی اولاد کے لیے قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ انہوں نے اپنے انتقال سے صرف تین دن قبل یعنی ۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء کو بعد نماز فجر رائے ونڈ کے مرکزِ تبلیغ میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فرموداتِ شیخِ طریقت حضرت مولانا محمّد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

"دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے چمکائے گا، ورنہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔

یہ اُمت بڑی مشقت سے بنی ہے۔ اس کو اُمت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بڑی مشقّتیں اٹھائی ہیں اور اُن کے دشمن یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اس کی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک اُمت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا اُمت پنا (یعنی اُمّت ہونے کی صفت) کھوچکے ہیں۔ جب تک یہ اُمّت بنے ہوتے تھے، چند لاکھ ساری دنیا پر بھاری تھے۔ ایک پکّا مکان نہیں تھا مسجد تک پکّی نہیں تھی مسجد میں چراغ

تک نہیں جلتا تھا، مسجدِ نبویؐ میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داریؓ ہیں، وہ ۹ھ میں اسلام لائے ہیں اور ۹ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک اُمت بن چکے تھے۔ تو جب یہ سب کچھ ہو گیا اس وقت مسجدِ نبویؐ میں چراغ جلا، لیکن حضورؐ جو نورِ ہدایت لے کر تشریف لاتے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور اُمّت بن چکی تھی۔ پھر یہ اُمّت دنیا میں اُٹھی۔ جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گرے۔ یہ امت اس طرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا۔ مال و جائیداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ اور رسولؐ کیا فرماتے ہیں۔ امت جب ہی بنتی ہے جب اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں سارے رشتے اور تعلقات کٹ جائیں۔ جب مسلمان ایک اُمّت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری امت ہل جاتی تھی۔ اب ہزاروں لاکھوں گلے کٹتے ہیں اور کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

امّت کسی ایک قوم اور ایک علاقے کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سینکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جُڑ کر امت بنتی ہے۔ جو کسی ایک قوم اور ایک علاقے کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ امت کو ذبح کرتا ہے۔ اور اُس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے۔ اُمّت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا ہے۔ اگر مسلمان اب پھر امّت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں بھی مل کر اُن کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم امت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لیے پٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے امت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں۔ ساری تباہی

اس وجہ سے ہے کہ اُمت اُمت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ امت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح امت بنائی تھی؟

امت ہونے کے لیے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل ابنِ ملجم ایسا نمازی اور ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اس کی زبان کاٹنی چاہی تو اُس نے کہا سب کچھ کرلو، لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا کہ علیؓ کا قاتل میری امت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا۔ اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی۔ حالانکہ انہوں نے ہی اکبر کو گمراہ کرکے دین کو برباد کیا تھا۔ تو جو باتیں ابن ملجم اور ابوالفضل اور فیضی میں تھیں وہ اُمت بننے کے لیے اور خدا کی غیبی نصرت کے لیے کیسے کافی ہوسکتی ہیں؟

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کے ساتھی دینداری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے۔ وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنالیا تو وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات آگئی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ، ان کی بات یہاں کیوں چلے۔ اُنہوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کردیئے گئے۔ اور اس طرح خود مسلمانوں نے، علاقائی بنیاد پر امت پنے کو توڑ دیا۔ اللہ نے اس کی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا۔

یاد رکھو، میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب امت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارے میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجے میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہوجاتی) اس کا نتیجہ حضرت سعدؓ کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنات نے قتل کردیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا۔

قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ
رمیناہ بسھم فلم یخط فوادہ

(ہم نے قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا) اس واقعہ نے ثابت کر دیا اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقے کی بنیاد پر امت پنے کو توڑے گا تو اللہ تعالےٰ اس کو توڑ کر رکھ دیگا۔

امّت جب بنے گی جب امت کے سب طبقے بلاتفریق اُس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کے گئے ہیں اور یاد رکھو امت پنے کو توڑنے والی چیزیں معاشرت اور معاملات کی خرابیاں ہیں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہے اور اس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف دیتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور امت پنا ٹوٹتا ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے امّت نہیں بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اِس امت کو امّت بنایا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے۔ ان کی تقسیم کا مشورہ ہوا۔ اُس وقت امت بنی ہوئی تھی۔ یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلے یا ایک ہی طبقے کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے مشورے سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلے والوں کو دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے قبیلے والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلے والوں کو۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آئے۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپؐ کے صدقہ میں مل رہا ہے، اس لیے بس حضورؐ کے تعلق کو ہی معیار بنایا جائے۔ جو نسب میں آپ کے زیادہ قریب ہوں ان کو زیادہ دیا جائے۔

جو دوم، سوم، چہارم نمبر ہوں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے۔ اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے، اس کے بعد بنی عبد مناف کو، پھر قصیٰ کی اولاد کو، پھر کلاب کو، پھر کعب کو، پھر مرّہ کی اولاد کو۔ اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلے کو اتنے پیچھے ڈال دیا۔ اس طرح بنی تھی یہ اُمّت۔

اُمّت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو، پھوٹ نہ پڑے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ، سب کچھ کیا ہوگا، مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس کی کسی بات نے اُمّت میں تفریق ڈالی ہوگی۔ اُس سے کہا جائے گا کہ پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے، جس کی وجہ سے اُمّت کو نقصان پہنچا۔ اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز، روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوگا۔ مگر اس کو بہت ثواب سے نوازا جائے گا۔ وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے۔ اس کو بتایا جائے گا کہ تُو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے اُمّت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رُک گیا اور بجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اُسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمّت کے بنانے اور بگاڑنے، توڑنے اور جوڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے۔ یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے۔ زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کر دیتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبان پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اس کی ہر بات کو سن رہا ہے۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آ رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی

توفیق ملی تو حضورؐ کی، اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کس طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کر دیا۔ پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ حضورؐ سے کسی نے جاکر کہا۔ آپؐ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے۔ آپ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا۔ دونوں فریقوں نے محسوس کر لیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ "اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے دم تک پورے پورے مسلم اور خدا کے فرماں بردار بندے بنے رہو۔" جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا، اُس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اُس کی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اُسے نہیں بہکا سکے گا اور اُمت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔ وَٱعْتَصِمُوا بِحَبْلِ ٱللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَٱذْكُرُوا نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِۦٓ إِخْوَٰنًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ـــــ

اور اللہ کی رسّی کو یعنی اس کی کتاب پاک اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو۔ یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور اُمت بننے کی صفت کے ساتھ سب مل جل کر دین کی رسّی کو تھامے رہو اور اُس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقے کی بنیاد پر یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ اور اللہ کے اُس احسان کو نہ بھولو کہ اُس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنا دیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے

کنارے پر کھڑے تھے، بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔

شیطان تمہارے ساتھ ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر بُرائی اور ہر فساد سے روکنا ہو ــــــــ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

امت میں ایک گروہ وہ ہو، جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلاتے۔ ایمان کے لیے اور خیر اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لیے محنت کرتا رہے۔ نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے۔ برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لیے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے اُمت ایک اُمت بنی رہے "۔

(ماخوذ از "دو خطروں کا علاج" فرمودہ شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف ؒ، شائع کردہ: افتخار احمد فریدی، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔ انڈیا)

ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ اس تقریر کا ایک ایک لفظ دل سے نکلا ہے اور اس میں کسی تکلّف اور تصنّع یا آورد کا کوئی شائبہ موجود نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت اِسی سبق کی نہیں ہے جو ان فرمودات میں سامنے آتا ہے! کاش کہ ملّت کے دردمند اصحابِ ثروت اس تقریر کو نہ صرف اُردو بلکہ پاکستان کی جملہ علاقائی زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کے تقسیم کرائیں۔

نہی عن المنکر کا نبوی طریق کار

اب ذرا اپنی توجّہ کو دوبارہ مرتکز فرما لیجئے صحیح مسلم ؒ کی اُن دو روایات کی جانب جن میں نہی عن المنکر یعنی منکرات اور سیّئات کے سدِ باب کا تاکیدی حکم بھی وارد ہوا ہے اور اس کے تین مراتب و مدارج کا بھی ذکر ہے۔ ان دونوں حدیثوں کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) "حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی کسی بُرائی کو دیکھے اُس کا فرض ہے کہ اسے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) روک دے، اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ پاتا ہو تو (کم از کم) دل سے (نفرت کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے!"

(۲) "حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے کوئی ایسا نبی نہیں گزرا جسے اللہ نے کسی اُمت میں مبعوث فرمایا ہو اور اس میں اس کے صحابی اور حواری پیدا نہ فرماتے ہوں جو اس کی سنّت کو مضبوطی سے تھامتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر (ہمیشہ ایسا ہوا کہ) اُن کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہو جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہ تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوتا تھا۔ تو جس کسی نے ایسے لوگوں کے ساتھ ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور اس کے بعد تو ایمان ایک رائی کے دانے کے برابر بھی موجود نہیں ہے!"

اب یہ امر تو ایسا ظاہر و باہر ہے کہ جس کے بارے میں کسی صاحبِ ایمان کو ذرّہ برابر شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان تینوں درجوں میں سے بلند ترین ہی کو اختیار فرمایا اور طاقت ہی کے ذریعے منکرات اور سیّئات کا فوری استیصال بھی کیا اور آئندہ کے لیے سدِّ باب بھی فرمایا لیکن سوال یہ ہے کہ آنحضورؐ نے طاقت کا یہ استعمال کس طریق پر کیا؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حضورؐ نے طاقت کا استعمال اس طرح نہیں کیا کہ جب آپؐ نے دعوت شروع کی تو بیس پچیس سعید روحیں آپؐ پر ایمان لے آئی تھیں، ان کا ایک چھوٹا سا جتھہ بناتے اور انہیں حکم دیتے کہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر جاؤ اور کعبہ شریف میں رکھے ہوئے سارے بُت توڑ دو۔ ذرا غور فرمایئے کہ حضورؐ ایسا کر سکتے تھے یا نہیں؟ —— یقیناً کر سکتے تھے اور عملاً یہ بالکل ممکن تھا اس لیے کہ وہاں کعبہ کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی مسلّح پہرہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جا کر صحابہ کرامؓ تمام بتوں کو توڑ سکتے تھے۔ یہ مکّہ میں سب سے بڑا منکر

تھا کہ نہیں ہے لیکن حضورؐ نے اسے برداشت کیا۔ کیوں کیا ہے اس لیے کہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ پہلے ایک معتد بہ افراد کی ایک جمعیت فراہم کی جائے۔ فدائین اور تربیت یافتہ جاں نثاروں کی ایک جماعت تشکیل دی جائے۔ گویا ایک طاقت فراہم کی جائے۔ یہاں تربیت سے مراد عسکری تربیت نہ لے لیجئے گا۔ اس سے مراد ہے روحانی و اخلاقی تربیت جس کے لیے ہمارے دین کی اصطلاح ہے تزکیہ۔ ایک کام کرنے کے بعد اسے برقرار رکھنا اصل کام ہے۔ ایک مرتبہ کعبہ کے تمام بتوں کو توڑ دینا اصل کام نہیں ہے۔ توڑنے کے بعد توحید کا نظام برقرار رہے اور یہ کام سرانجام دینے والی طاقت قائم رہے۔ جب تک یہ شکل پیدا نہیں ہوگئی جناب محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ توحید کی بذریعہ قرآن زبانی دعوت و تبلیغ فرمائی۔ جو لوگ ایمان لائے انہیں منظّم کیا۔ ان کی تربیت کی، ان کا تزکیہ فرمایا۔ ان میں قربانی اور ایثار کا مادّہ پیدا کیا۔ ان میں دین کے لیے تن من دھن لگا دینے کا ایک عزمِ مصمّم پیدا کیا۔ پھر ان کے اندر ایک ڈسپلن پیدا کیا کہ جو حکم دیا جائے مانیں۔ چنانچہ قریباً بارہ برس تک مکّہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ مسلمانو! تمہارے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تب بھی تمہیں ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت خبّاب ابن ارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے لیکن مسلمانوں کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ کیا مسلمان بے غیرت تھے! معاذ اللہ۔ خاص طور پر جب میں یہ سوچتا ہوں تو مجھ پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے کہ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے شہید کیا ہے اور کس طرح شہید کیا ہے! کس قدر کمینگی کے ساتھ انہیں ایذائیں پہنچاتی ہیں۔ ماں کو جوان بیٹے کے سامنے ننگا کیا ہے۔ پھر مزید جو کچھ کیا ہے میرے قلم پر نہیں آسکتا۔ اور بالآخر جب شہید کیا ہے تو تاک کر اُنؓ کی شرم گاہ میں اس طرح برچھا مارا ہے کہ پُشت سے آرپار ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ مجمعِ عام میں ہو رہا ہے اور اس وقت تک کم سے کم تیس چالیس مسلمان موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک ہزاروں بلکہ لاکھوں کے برابر تھا۔ سوچئے کہ کیا یہ تیس چالیس مسلمان معاذ اللہ بے غیرت تھے! ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ ہماری ایک بہن جو محمدؐ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والی ہے، اس کے ساتھ ابوجہل یہ بہیمانہ سلوک کر رہا ہے۔ اگر انہیں اجازت ہوتی تو کیا وہ ابوجہل کی تکا بوٹی نہ کر دیتے! لیکن اجازت نہیں تھی۔ کبھی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آلِ یاسر جو تین افراد پر مشتمل گھرانہ تھا، حضرت یاسرؓ، ان کی اہلیہ حضرت سمیّہ اور ان کے بیٹے عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم،

اُن پر ابوجہل نے جو مسلسل ستم ڈھا رکھا تھا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سامنے سے گزرتے تھے تو انہیں تلقین فرماتے تھے: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ یعنی "اے یاسر کے گھر لنے والو! صبر کرو اس لیے کہ تمہارے وعدے کی جگہ جنّت ہے" ——— حضورؐ نے قریباً بارہ برس تک یہ تربیت دی ہے۔ سوچیے کہ یہ تربیت کس بات کی تھی۔ اس بات کی کہ ایک طرف اپنے موقف پر ڈٹے رہو، قدم پیچھے نہ ہٹے لیکن دوسری طرف تمہارا ہاتھ نہ اُٹھے، بلکہ جھیلو اور برداشت کرو۔ اگر جان چلی جائے تو فہو المطلوب شہید ہو گئے تو فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ اِدھر تمہاری آنکھ بند ہوتی اُدھر جنّت میں داخلہ ہو گیا۔ سورۂ یٰسٓ تو آپ پڑھتے ہوں گے، وہاں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب رسولوں کی تصدیق کرنے والے شخص نے یہ کہا تھا: "اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝" یعنی "سُن لو کہ میں تو ایمان لاتا ہوں اس پر جو تم سب کا ربّ ہے"، تو فوراً انہیں شہید کر دیا گیا۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف جو نتیجہ نکلا اسے بیان کر دیا:

"قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّۃَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَلِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ۝" یعنی جیسے ہی شہید ہوئے جنّت میں داخلہ کا پروانہ مل گیا اور انہوں نے کہا کہ کاش میری قوم کو میرے اس اعزاز کا علم ہوتا۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں نے کتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے جس کا کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ مجھے میرے ربّ نے حساب کتاب کے بغیر بخش دیا، میرے تمام گناہ معاف کر دیئے اور مجھے اعزاز و اکرام پانے والوں میں شامل فرمایا۔ تو جن لوگوں کو بھی شہادت نصیب ہو جاتی لاریب وہ اپنے مطلوب کو پا گئے۔

پس منکرات کا استیصال جو طاقت کے ساتھ ہے، قوّت کے ساتھ ہے، گویا "بِیَدِہٖ" ہے، اس کا ایک PROCESS ہے، ایک طریقہ ہے۔ وہ طریقہ ہمیں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام سے لینا ہوگا۔ وہ وقت بھی آیا کہ حضورؐ نے طاقت کو استعمال فرمایا اور آپؐ کے ہاتھ میں تلوار آئی۔ غزوۂ بدر میں سپہ سالار کون تھے! محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! احد میں سپہ سالار کون تھا! میدانِ احد میں مورچہ بندی کون کرا رہا تھا! محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن طاقت کے استعمال کے مرحلہ سے پہلے جو مراحل ہیں، انہیں ملحوظ رکھنا اور انہیں طے کرنا ضروری ہے وہ مراحل ہیں کہ قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے پہلے ایک جمعیت فراہم کی جائے۔ اس

میں وہ افراد شریک ہوں جو شعوری طور پر تقویٰ، اطاعت اور فرماں برداری کی روش اختیار کریں۔ تکمیل کی بات نہیں ہے۔ تکمیل تو موت تک نہیں ہوگی۔ لیکن یہ تو ہو کہ فیصلہ کر کے ایک عزمِ مصمّم کے ساتھ تقویٰ اور اسلام کی راہ پر چل پڑے ہوں: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ ــــــ پھر وہ باہم جڑیں، باہم مربوط ہوں: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ــــــ پھر ان کی آپس کی محبّت مثالی محبّت ہو۔ وہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ اور اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کا کامل پیکر ہوں اور ان کا حال یہ ہو: وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْکَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ۔ اور وہ اپنی جانوں سے اپنے مسلمان بھائیوں کی ضروریات کو مقدّم رکھتے ہیں چاہے اپنے اُوپر فاقے گزر رہے ہوں۔ ان کی محبّتیں ایسی ہوں کہ ایک زخمی کراہ رہا ہے۔ جان نکلنے کے قریب ہے اور پکار رہا ہے العطش، العطش۔ پانی کا پیالہ ان کے پاس لایا جاتا ہے کہ دوسرے بھائی کی آواز آجاتی ہے العطش، العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پانی پلاؤ۔۔۔ پیالہ وہاں پہنچتا ہے کہ تیسرے زخمی کی آواز آتی ہے العطش، العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پانی پہنچاؤ۔ پیالہ تیسرے کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے۔ پیالہ دوسرے کے پاس واپس آتا ہے تو ان کا دم بھی نکل چکا ہوتا ہے۔ اب پیالہ پہلے زخمی کے پاس لایا جاتا ہے تو ان کی رُوح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی۔ ایک طرف یہ ایثار اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی یہ شان اور دوسری طرف یہ رویّہ اور کیفیت کہ: فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا ــــــ سنو اور اطاعت کرو۔ (LISTEN AND OBEY) اگر یہ ڈسپلن نہیں تو یہ جماعت نہیں، MOB ہے۔ یہ حزب اللہ نہیں ہے، ایک ہجوم ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال نے اسی فرق کو واضح کیا ہے ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں   عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں!

یہ ہجوم ہوتا ہے چاہے دو لاکھ کا مجمع ہو۔ کوئی نظم نہیں، کوئی ڈسپلن نہیں، کوئی کسی کا حکم سننے والا اور ماننے والا نہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ گویا سقراط و بقراط ہے۔ کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے والا نہیں ہے۔ اس ہجوم سے کوئی مثبت اور نتیجہ خیز کام نہیں ہوتا۔ یہ کام اگر ہوگا تو صرف ایک منظّم جماعت

کے ذریعہ سے ہوگا۔

اسی بات کو نہایت تاکیدی اسلوب سے اس آیت مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ـــــــ تم میں سے لازماً ایک گروہ، ایک جماعت، ایک (چھوٹی) اُمّت ایسی ہونی چاہیے جس میں شامل لوگ خیر کی طرف دعوت دینے، پکارنے اور بلانے والے ہوں نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہوں ـــــــ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبان سے تو ہر وقت ہو سکتا ہے، صرف انسان کے اندر جرأت کی ضرورت ہے۔ جس بات کو حق اور صحیح سمجھے اسے بیان کرے۔ اِسی لیے تو فرمایا گیا کہ: اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔ منکرات کے خلاف سلطانِ جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں افضل الجہاد کہا ہے اور اس دَور میں اصل سلطان عوام الناس ہیں جن کے ووٹوں سے اقتدار کسی پارٹی کے سپرد ہوتا ہے۔ گویا بقول علّامہ اقبال یہ "سلطانیٔ جمہور" کا زمانہ ہے۔ اس لیے جہاں نہی عن المنکر کا ایک رُخ اربابِ اقتدار کی طرف ہونا چاہیے وہاں اس سے بھی زیادہ شدّ و مد کے ساتھ اس کا رُخ معاشرہ کی طرف ہونا چاہیے۔ اگر نہی عن المنکر سے پہلوتہی ہوگی، اعراض ہوگا تو اس کا دو کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا کہ یا بزدلی ہے یا بے حمیتی ہے باقی اور کوئی شکل نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ بات بھی جان لیجئے کہ امر بالمعروف بہت آسان کام ہے لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا، نصیحت کرنا، اعمالِ صالحہ کے فضائل بیان کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگرچہ ان کی بھی اہمیّت ہے اور کون ہے جو اس سے انکار کرے گا، لیکن اس کے ذریعے سے کچھ لوگ صرف انفرادی طور پر نیکوکار بن جائیں گے۔ معاشرہ ہرگز تبدیل نہیں ہوگا جب تک منکرات کے خلاف جماعتی سطح پر منظّم محنت، سعی و کوشش، جدّ و جہد بلکہ خالص دینی اصطلاح میں جہاد نہ ہو، اور یہ واقعی مشکل اور جان جوکھوں کا کام ہے۔

لہٰذا اس جہاد کے لیے جس کے اعلیٰ مقام و مرتبہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد بالید یعنی طاقت کے ساتھ جہاد قرار دیا ہے: فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے ایک جماعت تشکیل دی جائے جس میں شامل لوگوں میں ایک

طرف تقویٰ اور فرماں برداری کے اوصاف ہوں، دوسری طرف اعتصام وتمسّک بالقرآن کا عمل ہو، اور تیسری طرف اس جماعت کے لوگ باہم نہایت محبّت کرنے والے اور ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے والے ہوں۔ اور آخری بات یہ کہ سمع وطاعت کے نظم کے ساتھ ایک امیر کی اطاعت فی المعروف کو اپنے اُوپر لازم اور واجب بلکہ فرض سمجھنے والے ہوں ——— اس کام کے لیے جو جماعت درکار ہے اس کے اوصاف کی رہنمائی ہمیں اس حدیث سے ملتی ہے جو حضرت حارث الاشعریؓ سے مروی ہے اور جسے امام احمد ابن حنبل اور امام ترمذی رحمہما اللہ بالترتیب اپنی 'مُسند' اور اپنی 'جامع' میں لائے ہیں۔ حضرت حارث الاشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ——— "میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت کا، سمع وطاعت کا، اور اللہ کی راہ میں ہجرت وجہاد کا۔" ایک دوسری روایت میں 'اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ' کے بعد الفاظ آئے ہیں: "اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ" یعنی "اس کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے۔" یعنی میں تم کو یہ حکم اللہ کے حکم کی تعمیل میں دے رہا ہوں۔ اس حدیث میں 'ہجرت وجہاد' کی جو اصطلاحات آئی ہیں ان کے وسیع تر معانی ومفاہیم پر بعد میں گفتگو ہوگی۔

موجودہ دَور میں 'نہی عن المنکر بالید' کی عملی صورت

اب توجہ فرمایئے اس مسئلے کی جانب کہ اگر مطلوبہ اوصاف والی جماعت وجود میں آجاتی ہے اور نہی عن المنکر باللّسان یعنی زبان وقلم کے ذریعے منکرات کے خلاف جہاد کا حق ادا کیا جاچکا ہو تو اس کے بعد ہاتھ یا قوّت سے نہی عن المنکر کے لیے کس طرح اقدام کیا جائے گا۔

اس کے جواب کے لیے پہلے مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہے ——— آج سے چند سال پہلے ۲۳ مارچ کا دن آنے والا تھا، جسے 'یومِ پاکستان' کے نام سے ہر سال دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ میں ۲۳ مارچ سے چند دن پہلے عمرہ کے لیے جانے والا تھا کہ مجھے لاہور کے ایک گرلز کالج کی پرنسپل صاحبہ کا فون آیا کہ "آپ نے کبھی سوچا نہیں کہ ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کو سڑکوں پر جوان لڑکیوں کی پریڈ ہوتی ہے اور اس کو دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے

ٹھٹ لگے ہوتے ہیں۔ جوان لڑکیاں سینہ تان کر پریڈ کرتی ہیں۔ اس پر آپ نے کبھی کوئی نکیر نہیں کی؟ میں واقعی حیران ہوا کہ کیوں میری توجہ اس طرف نہیں ہوئی! میں نے اپنے آپ کو پہلے یہ 'الاؤنس' دیا کہ میں نے آج تک کوئی پریڈ نہیں دیکھی۔ نہ میرے ہاں ٹی وی ہے کہ اس پر دیکھنے کا کسی طور موقع ملتا۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اخبارات میں فوٹو تو چھپتے ہیں۔ وہ تو نظر سے گزرے ہیں۔ پھر مجھے افسوس ہوا کہ اتنے بڑے منکر کی طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔ میں دل ہی دل میں نادم ہوا۔ عمرہ کے لیے روانگی سے قبل حسب معمول مجھے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں جمعہ کی تقریر کرنی تھی۔ باغ جناح کے قریب ہی جی۔ او۔ آر (G.O.R) ہے۔ لہٰذا بہت سے اعلیٰ گورنمنٹ آفیسرز وہاں آتے ہیں، کنٹونمنٹ بھی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ لہٰذا بہت سے اعلیٰ ملٹری آفیسرز بھی وہاں ہوتے ہیں ــــــ تو میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ خدا کے لیے جس کی بھی جناب صدر تک پہنچ اور رسائی ہے وہ یہ بات ان تک پہنچائے کہ یہ بہت بڑا منکر ہے۔ لڑکیوں کی پریڈ کرانی ہے تو قذّافی اسٹیڈیم میں کرالیں۔ وہاں پریڈ دیکھنے صرف ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ بچیوں کو ملٹری ٹریننگ دیجئے، رائفل ٹریننگ دیجئے۔ جیسے گرلز کالجوں کے گرد اگر چہار دیواری ہوتی ہے اور عمارتیں باپردہ ہوتی ہیں تو ایسی چہار دیواری والے میدانوں میں بچیوں کو ٹریننگ دیجئے اور قذافی سٹیڈیم میں ان کی پریڈ کرایئے جس میں مردوں کا داخلہ بالکل ممنوع ہو لیکن ہماری جوان بچیاں پریڈ میں سینہ تان کر چلتی ہیں، وہ جھک کر تو نہیں چلتیں، نہ وہ ادھیڑ عمر یا بوڑھی ہوتی ہیں۔ یہ بہت بڑا منکر ہے۔ میں اس تقریر کے بعد عمرے کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو ۲۴ مارچ تھی۔ ۲۴ مارچ کو صبح کے روزنامے شائع نہیں ہوتے۔ مجھے ہوائی جہاز میں شام کے اخبار ملے۔ اکثر اخبارات میں اس خبر کا چرچا تھا اور انگریزی روزنامے کی تو پہلی سرخی یہ تھی:

"WOMEN'S PARADE TOOK PLACE DESPITE THE LETTER OF MIAN TUFAIL"

اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میاں طفیل محمد صاحب نے بھی صدر ضیاء الحق صاحب کو اس بارے میں کوئی خط لکھا تھا لیکن میاں صاحب کے خط کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ پریڈ ہوئی اور ان لوگوں نے بغلیں بجائیں جو ہمارے ملک میں بے حجابی، بے پردگی اور فحاشی کے علمبردار ہیں۔ اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ اس بات کو چھاپا ــــ گویا اس طرح ان سب دین دوست افراد کا استہزا کیا گیا

جو منکرات کو مٹانے اور معروفات کو فروغ دینے کے داعی اور علمبردار ہیں۔

اب یہ بات جان لیجئے کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو کہ جو الیکشن کے لیے ووٹوں کی بھیک مانگتی نہ پھر رہی ہو اس لیے کہ اس طور پر تو معاملہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر ؏ مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج! ـــــ اوّلاً اگر اسلام کے نام پر الیکشن میں کامیاب ہونے والا ایک شخص بھی خراب نکل آئے تو پوری جماعت پر حرف آئے گا یا نہیں ؟ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کر سکتی ہے اور ایک کالی بھیڑ پورے گلے کو مشکوک بنا سکتی ہے۔ پھر یہ کہ جب آپ ووٹ مانگتے ہیں تو لوگوں کے غلط عقائد، غلط اعمال پر تنقید اور نکیر نہیں کر سکتے۔ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم خلافِ اسلام کام کر رہے ہو، تم حرام خوریاں کر رہے ہو، تم خلافِ قانون کام کر رہے ہو چونکہ انہی سے تو آپ نے ووٹ لینے ہیں۔ لہٰذا آپ یہ باتیں نہیں کہہ سکتے۔ اب اس الیکشن کی اسلام کے حق میں آخری خرابی کی بات بھی سُن لیجئے۔ جب آپ بھی الیکشن میں اسلام کے نام پر ووٹ مانگیں گے اور کوئی دوسری جماعت بھی اسلام کے نام پر ووٹ مانگے گی تو دو اسلام ہو گئے یا نہیں ؟ تین یا چار جماعتیں اسلام کے نام پر الیکشن میں حصّہ لے رہی ہوں تو تین یا چار اسلام ہو جائیں گے یا نہیں! ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت جس شدّت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کا سب سے بڑا سبب اسلام کے نام پر الیکشن لڑنا ہے۔ ہر گروہ اپنے مخصوص شعائر کا جن کا اسلام سے یا تو سرے سے کوئی تعلق نہ ہو یا اگر ہو تو محض فروعی ہو، اس طرح پروپیگنڈا کریگا گویا یہی اصل اسلام ہے۔ عوام النّاس جن کی عظیم اکثریت اسلام کی تعلیمات سے ناواقف ہے وہ مزید انتشارِ ذہنی میں مبتلا ہوں گے یا نہیں ؟ اور ہمارے خواص، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پہلے ہی سے دین کے معتقدات و اساسات کے بارے میں تشکیک و ریب میں مبتلا ہیں ان جماعتوں کا ساتھ دیں گے یا نہیں جو سیکولر (لادینی) ذہن کی حامل اور علمبردار ہیں۔ ۷۰ء کے الیکشن میں جس سے زیادہ FAIR الیکشن پاکستان میں تا حال کبھی نہیں ہوا یہ نتیجہ سامنے آ چکا ہے یا نہیں ؟ لہٰذا اس بات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ الیکشن کے راستے سے یہاں اسلام نہیں آئے گا۔ جو حضرات نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اسلام آ سکتا ہے اگر ان کی نیتوں میں واقعی خلوص و اخلاص ہے تو وہ لگے رہیں۔ خلوص و حسنِ نیّت کا وہ اللہ تعالےٰ کے

یہاں اجر ضرور پائیں گے۔ بشرطیکہ اخلاصِ نیّت کے ساتھ وہ ان غلط کاموں سے اپنا دامن بچائیں جو الیکشن کا خاصّہ بن گئی ہیں، جیسے جعلی ووٹنگ، ووٹوں کی خریداری، علاقائی، لسانی اور برادری کی عصبیتوں کو ابھارنا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی صورت میں ان کا اجر ضائع نہیں ہوگا لیکن ساتھ ہی اس کا بھی یقین ہے کہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ قوّتوں کا، صلاحیتوں کا، سرمایہ کا محض ضیاع ہوگا۔ اسلام اس راستہ سے آ ہی نہیں سکتا۔ اس الیکشن بازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جماعتوں کے تحزّب اور تخالف سے ملّی اتحاد میں ایسے رخنے پیدا ہوتے ہیں کہ انتہائی کوشش کے باوجود ان کا بھرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ تحزّب و تخالف بسا اوقات دائمی نفرت اور عداوت کا رُخ اختیار کر لیتا ہے جس کی تباہ کاریوں سے کون ہے جو ناواقف ہوگا۔

پاکستان میں اسلام آئے گا تو اس طور پر کہ اگر کوئی ایسی جماعت ہے اور معتدبہ افراد پر مشتمل ہے کہ انفرادی طور پر اس کا ہر رکن تقویٰ اور اسلام کی روش پر کاربند ہونے کے لیے دل و جان سے کوشاں ہے۔ حبل اللہ یعنی قرآن مجید سے اس کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہر نوع کے فقہی اختلافات سے اس کا دامن محفوظ ہے۔ وہ ائمہ اربعہ اور محدّثین علیہم الرّحمۃ کے فقہی اختلافات کو صرف تعبیر کا، استنباط کا اور راجح و مرجوح اور افضل و مفضول کا فرق سمجھتا ہے۔ وہ جماعت اقتدارِ وقت کو چیلنج کرے گی کہ منکرات کا کام ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے یہ ہماری لاشوں ہی پر ہوگا۔ منکرات وہ سامنے رکھے جائیں گے جن کے منکر ہونے پر کسی فقہی مکتبِ فکر کو اختلاف نہ ہو۔ سب اس کو منکر تسلیم کرتے ہوں۔ جیسے بے حیائی اور بے پردگی اور سودی نظامِ معیشت —— یہ ہے اصل طریقِ کار۔ یہ ہے ایک مسلمان ملک میں "مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ" کے فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام پر تعمیل کی کوشش کیا آج لوگ اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے لیے یہ سب کچھ نہیں کرتے ہے؟ یہ ایجی ٹیشن کیوں ہوتا ہے! یہ مظاہرے کیوں ہوتے ہیں! صرف سیاسی حقوق کے لیے یا صرف کسی دنیاوی سہولت کے لیے۔ لیبر یونینیں اپنی اُجرت بڑھوانے اور دوسری مراعات حاصل کرنے کے لیے مظاہرے کرتی ہیں یا نہیں ہے؟ یہی ایجی ٹیشن اگر صرف دین کے لیے اور نہی عن المنکر کے لیے ہوں کہ یہ منکر کام ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے تو یہ طریقہ ان شاء اللہ پانسہ پلٹ کر رکھ دے گا۔

کامیابی کی لازمی شرط

بدامنی اور توڑ پھوڑ سے کُلّی اجتناب

البتّہ اس کی شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ پُرامن ہو۔ یہ نہیں کہ آپ نے ٹریفک سگنل توڑ دیئے۔ ایک چلتی بس ٹھہرائی اور اس کے ٹائروں سے ہَوا نکال دی۔ اس سے کیا حاصل ہوا ہ ـــــ اس بس کے جو ساٹھ ستّر مسافر بیٹھے ان کو آپ نے تکلیف پہنچائی۔ نہ معلوم کس کو کتنی دُور جانا تھا! یا سرکاری املاک اور خاص طور پر سرکار کے زیرِ انتظام چلنے والی بسوں کو آگ لگا دی۔ معاذاللہ! وہ بس کسی غیر کی نہیں تھی۔ اس غریب قوم کی تھی جس کا ایک ایک بال بیرونی قرضوں میں بندھا ہوا ہے۔ آپ نے سرکاری املاک اور بسوں کو نقصان پہنچا کر اور جلا کر اس غریب قوم پر قرضوں کے بار میں مزید اضافہ کر دیا۔ حکومت یہ کرے گی کہ کوئی نیا غیر ملکی قرضہ لے گی اور اس نقصان کو پُورا کر لے گی۔ نتیجہ! یہ کہ قوم قرضوں کے بوجھ تلے مزید دب جائے گی۔ پھر پولیس کی کوئی لاری یا ٹرک آیا تو اس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ نتیجۃً یہ کہ پولیس والے جو آپ ہی کے بھائی بند ہیں، آپ کے خلاف مشتعل ہو گئے ـــــ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دیکھئے۔ بارہ برس تک مکّہ میں حضورؐ پر اور خاص طور پر آپؐ کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر تشدّد ہوا لیکن کسی نے ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ انہیں مارا گیا، ایک مومن خاوند و بیوی حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیّہؓ نہایت بہیمانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ حضرت بلالؓ کو سفاکانہ طور پر مکّہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر اس طرح گھسیٹا گیا جیسے کسی مردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے جس کو ایک سلیم الطبع شخص گوارا نہ کرے۔ حضرت خبّابؓ کو دہکتے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی کمر کی چربی اور خون سے انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ لیکن کسی کو بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ الغرض ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس کا مقصد یَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ وہ جماعت منظّم ہو اور اس جماعت کے کارکن تقویٰ، اسلام اور اعتصام بالقرآن کی سیڑھیوں پر کسی نہ کسی درجہ میں قدم رکھ چکے ہوں۔ اس کا عزمِ مصمّم کر چکے ہوں۔ وہ فقہی اختلافات میں الجھنے والے

نہ ہوں ـــــــ وہ جماعت ایک امیر کے حکم پر حرکت کرتی ہو۔ رُکنے کو کہا جائے تو رُکیں اور بڑھنے کو کہا جائے تو بڑھیں۔ جب تک یہ شکل نہیں ہو گی اسلامی نظام آنے کا امکان پیدا ہو گا نہ منکرات کے خاتمے کی سبیل پیدا ہو گی۔

دو ممکن نتیجے: اس طریق پر عملی جدّوجہد کے دو ہی ممکن نتیجے نکل سکتے ہیں: پہلا یہ کہ حکومتِ وقت پسپائی اختیار کرے اور ہمارے مطالبات کو مان لے۔ منکرات ختم ہوں، ان کی جگہ معروفات لے لیں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ منظّم مظاہروں کے ذریعہ سے پوری شریعت نافذ ہو جائے گی۔ چونکہ اربابِ اقتدار کو یہ اطمینان ہو گا کہ یہ جماعت اپنا اقتدار نہیں چاہتی بلکہ اس کا مقصود و مطلوب صرف اسلامی نظام ہے۔ چنانچہ انہی کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم و نافذ ہو جائے گا اور فہو المطلوب ـــــــ یا دوسری شکل یہ ہو گی کہ حکومت مزاحمت کرے اسے اپنی انا اور وقار کا مسئلہ بنا لے اور مسندِ اقتدار یا ایوانِ اقتدار کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہو جو چاہے زبانی کلامی اسلام کے اور اس کے نظامِ عدل و قسط کے بڑے قصیدہ گو اور مدح سرا ہوں لیکن جن کے قلوب حقیقی نورِ ایمان سے خالی ہوں تو وہ مزاحمت کریں گے، تصادم ہو گا، مظاہرین پر لاٹھی چارج ہو گا، گولیوں کی بوچھاڑ ہو گی، ان کو جیلوں میں ٹھونسا جائے گا، قید و بند کی تکالیف ہوں گی ـــــــ ان سب کو اگر یہ جماعت پُر امن طریق پر جھیل جائے، وہ مشتعل نہ ہو یعنی وہ کوئی جوابی کارروائی نہ کرے، نہ جماعت کا کوئی رکن معافی نامہ اور توبہ نامہ لکھ کر جیل سے بچنے کی فکر کرے تو ان شاءَ اللہ پھر بھی دو نتیجے نکلیں گے۔ یا تو وہ جماعت اس راہ میں قربان ہو جائے گی، کچل دی جائے گی، تو آخرت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی کامیابی ہے بلکہ اصل کامیابی یہی ہے: ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ دوسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ اس جماعت کو اپنے ایثار و قربانی سے عوام النّاس کی عملی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں اور وہ پوری طرح اس کا ساتھ دیں۔ مزید برآں خود پولیس اور فوج بھی تو مسلمان بھائیوں ہی پر مشتمل ہے۔ ان کی عملی ہمدردیاں بھی اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں گی۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پہلے تو شہنشاہ کے حکم پر پولیس اور فوج نے مظالم کی حد کر دی۔ لیکن جب انقلابی جماعت کے ساتھ عوام النّاس کی اکثریت بھی شامل ہو گئی تو فوج نے گولیاں برسانے اور پولیس نے لاٹھی چارج اور اشک آور گولوں کی بوچھاڑ کرنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تب ہی تو شہنشاہ ایران جیسے جابر شخص کو جس نے اپنے گرد اگرد ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے تقدّس کا ہالہ بھی قائم کر رکھا تھا، اپنی جان بچا کر ملک سے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ کم و بیش یہی صورتِ حال ۱۹۷۷ء کی نظام مصطفٰےؐ تحریک کے موقع پر پیش آئی بھٹو صاحب نے لاہور اور کراچی میں جزوی مارشل لا نافذ کر دیا تھا۔ لیکن وہ وقت آیا کہ فوج نے مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے بھٹو صاحب کو جھکنا پڑا اور وہ قومی اتحاد کے اکابر سے مصالحت کی گفتگو پر آمادہ ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور اس تصادم کا فائدہ کوئی دوسرا اٹھا لے گیا۔

ایسی جماعت کے وجود اور مقاصد کے لیے جہاں ہمیں اس آیتِ مبارکہ سے رہنمائی ملتی ہے کہ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" وہاں اس کے اصول و مبادی اور شرائط و اوصاف کے لیے رہنمائی اِس حدیث شریف سے ملتی ہے جو حضرت حارث الاشعریؓ سے مروی ہے۔ اس کا ترجمہ پھر سُن لیجئے۔ حضرت حارث الاشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت کا، سمع و طاعت کا، اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا ——— گویا اوّلاً جماعت درکار ہے، افراد نہیں، ہجوم نہیں، MOB نہیں پھر جماعت بھی ڈھیلی ڈھالی نہیں، چار آنے کی ممبری والی نہیں، صدروں کی ٹانگیں گھسیٹنے والی نہیں بلکہ سمع و طاعت والی۔ پھر اس جماعت کے سامنے مقاصد کیا ہوں گے ؟ اللہ کی راہ میں "ہجرت" اور "جہاد"!

ہجرت اور جہاد کی ابتدا اور انتہا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اَيُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ "یارسول اللہ بہترین اور اعلیٰ ہجرت کون سی ہے؟" آپؐ نے فرمایا: اَنْ تَهْجُرَ مَاكَرِهَ رَبُّكَ "ہر اُس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے ربّ کو پسند نہیں ہے"۔ گویا یہ ہے ہجرت کا نقطۂ آغاز۔ البتہ یہ نیّت رکھنی ضروری ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے، اسے قائم کرنے کی جدّ و جہد کے لیے گھر بار، اہل و عیال، مال و منال یہاں تک کہ اپنے وطن کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دوں گا۔

یہ نیت ہر مسلمان رکھے۔ لیکن اگر آپ کی زندگی میں کوئی معصیت ہے اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیجئے۔ اسی لمحہ سے ہجرت کا عمل شروع ہو جائے گا۔ مزید برآں عوام تو عوام ہمارے اکثر اہلِ علم بھی اِس مغالطہ میں ہیں کہ جہاد کے معنی جنگ کے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ہمارے دین کی ایک بڑی وسیع معانی اور مفاہیم رکھنے والی اصطلاح ہے۔ حضورؐ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ "یا رسول اللہ بہترین جہاد کون سا ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا: اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰہِ "کہ تم اپنے نفس سے جہاد کرو اور اسے اللہ کا مطیع بناؤ۔" ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے: "اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ" "حقیقی مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کے خلاف کشمکش کرے۔" تو جہاد یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اسی جہاد کے اگلے مراحل ہیں غیر اسلامی نظریات، منکرات اور غیر اسلامی نظام کے خلاف کشمکش اور پنجہ آزمائی۔ اسی جہاد کی بلند ترین چوٹی ہے "قتال فی سبیل اللہ"۔ لہٰذا دل میں یہ نیت رکھنی ضروری ہے کہ اے اللہ! وہ وقت آئے کہ صرف تیرے دین کے غلبہ کے لیے، تیرے کلمہ کی سربلندی کے لیے میری گردن کٹے۔ اس لیے کہ اگر یہ آرزو سینہ میں موجود نہیں ہے تو وہ ایک مومن کا سینہ نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے نہ تو اللہ کی راہ میں جنگ کی، نہ جنگ کی آرزو اپنے سینہ میں رکھی، نہ شہادت کی تمنا اپنے سینہ میں رکھی تو اگر اس حالت میں اسے موت آگئی تو "فَقَدْ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ" "یعنی ایسا شخص یقیناً ایک نوع کے نفاق پر مرا ہے۔" یعنی حقیقی ایمان پر نہیں مرا۔ تو یہ ہے ہجرت و جہاد — ہجرت شروع کہاں سے ہوئی! ترکِ معصیت سے اور کہاں تک جائے گی! ترکِ وطن تک۔ جہاد کہاں سے شروع ہوا! مجاہدہ مع النفس سے اور کہاں تک جائے گا! قتال فی سبیل اللہ تک — لیکن اس لائحہ عمل پر چلنے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے جو بیعتِ سمع وطاعت پر قائم ہو۔ البتہ اس کے ساتھ "فی المعروف" کی شرط ہوگی یعنی یہ کہ یہ سمع وطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ہو گی۔

خلاصۂ بحث

قصہ مختصر یہ کہ نہی عن المنکر کے اعلیٰ ترین درجے یعنی قوت و طاقت سے منکرات کے استیصال کا طریق کار وہ ہوگا جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا یعنی یہ کہ قرآن کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے ایک ایسی جماعت فراہم کی جائے اور تشکیل دی جائے جو اپنی استقامت سے، اپنے ثبات سے، اپنے صبر سے، اپنے ایثار سے، اپنی قربانی سے، اپنی باہمی محبت سے اور جماعتی طور پر ہجرت و جہاد سے اللہ کے دین کا بول بالا کرے، منکرات کا استیصال کرے۔ جو لوگ یہ کام کریں گے تو اس آیت کے آخر میں ان کو بشارت دی گئی: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے" ـــــ ایسے موقع پر ہمیشہ دل سے دعا کیا کیجئے: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ ـــــ اے اللہ ہمیں ان مفلحین میں شامل فرما جو تیرے بتاتے ہوئے ان تمام راستوں پر عمل پیرا ہوں۔ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اپنی انفرادی زندگیوں میں تقویٰ، اطاعت اور فرمانبرداری کی روش اختیار کریں۔ ہم قرآن سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے چلے جائیں۔ اس کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی اور عملی تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ اور اے اللہ! ہمیں ہمت دے کہ ہم ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کریں جو سمع و طاعت کی بنیاد پر قائم ہو اور جس کا مقصد صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ آمین یا ارحم الرّاحمین!

خطابِ ثانی

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

باہم لازم و ملزوم

○

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیّت

علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام

اور

عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ

○

ترتیب و تسوید

خالد محمود خضر
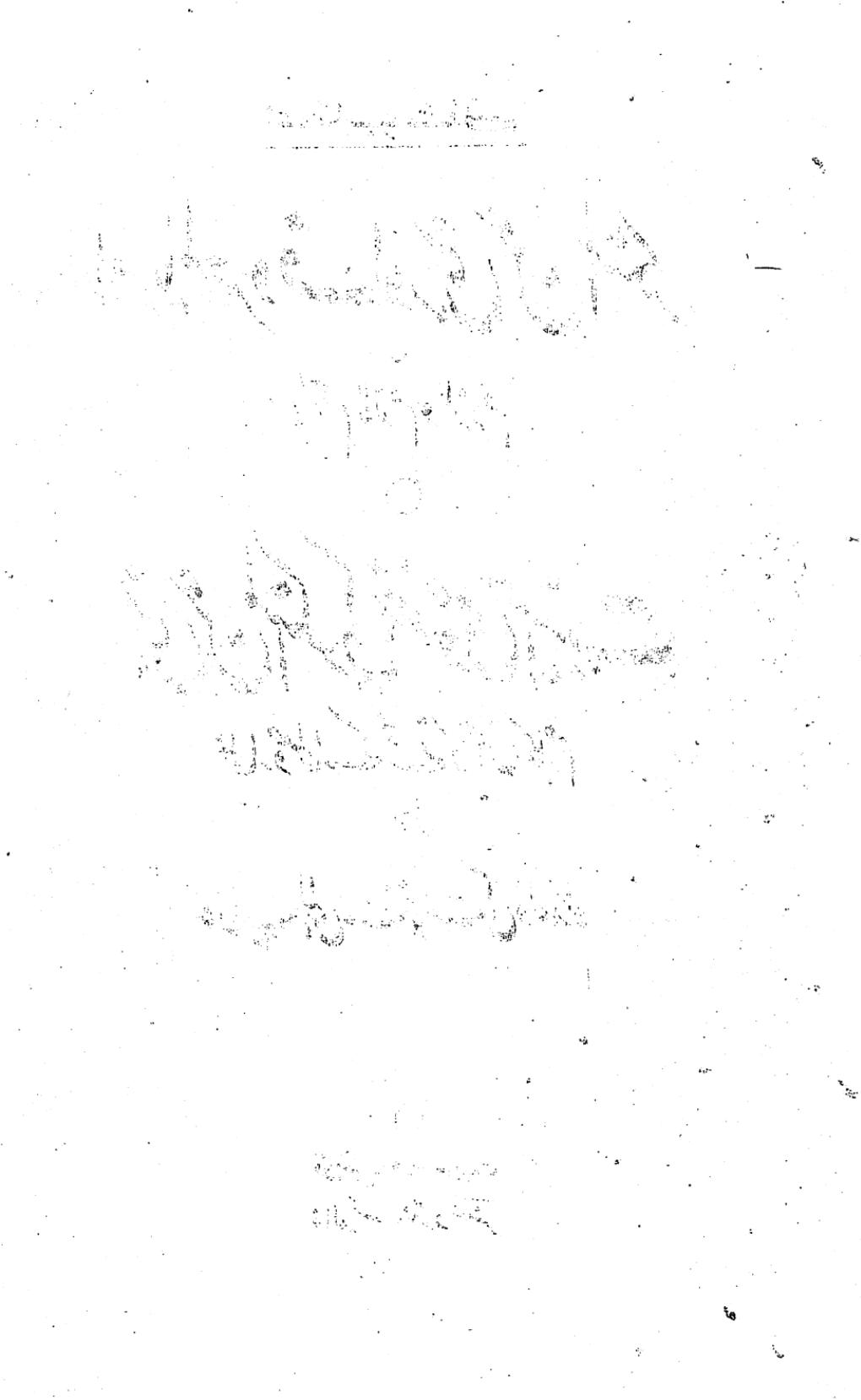
اُمّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس

قرآنِ حکیم کی دو۲ اصطلاحات کے حوالے سے

امّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس اور اس کے مقصدِ وجود کے بیان میں قرآن مجید نے دو۲ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح ذرا فلسفیانہ ہے اور اسے سمجھنے کیلئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ دوسری اصطلاح نسبتاً عام فہم اور آسان ہے۔ قرآنِ حکیم چونکہ عوام اور خواص سب کے لیے کتابِ ہدایت ہے' اس میں فلاسفہ و حکماء کے لیے بھی رہنمائی ہے اور عوام النّاس کے لیے رہنمائی کا فریضہ بھی اسی کتابِ عزیز کو سرانجام دینا ہے' لٰہذا آپ دیکھیں گے کہ اس میں اگرچہ بڑے گہرے علمی مضامین اور فلسفیانہ مباحث بھی ہیں لیکن یہ اپنے اصل مقصد کو بڑے عام فہم انداز اور بڑی سلیس زبان میں بھی ادا کر دیتا ہے۔ تاکہ ایک طرف اہلِ خرد کے لیے سامانِ غور و فکر مہیّا ہو جائے تو دوسری طرف عوام بھی اس کی ہدایت و رہنمائی سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ امّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس کے لیے بھی اس میں دو۲ اصطلاحات بیان فرمائی گئیں۔ (۱) شہادت علی النّاس (۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

ان دو۲ اصطلاحات پر غور کرنے سے پہلے امّت کی غرضِ تاسیس کی اہمیّت کو سمجھئے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی بھی اجتماعی ہیئت تشکیل دی جائے' خواہ وہ ایک چھوٹے سے چھوٹا ادارہ ہی کیوں نہ ہو' تو سب سے پہلے اس کے اغراض و مقاصد اور اہداف معیّن کیے جاتے ہیں۔ تو یہ جو اتنی بڑی امت تشکیل دی گئی تو اس کی غرضِ تاسیس کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ امّت کے تو معنی ہی "ہم مقصد لوگوں کی اجتماعیت" کے ہیں۔ عربی زبان میں "اَمَّ ۔ یَؤُمُّ" کے معنی ہیں "قصد کرنا" ارادہ کرنا۔ قرآن مجید میں حُجّاجِ کرام کو "آمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ"[۱] کہا گیا ہے جو اطراف و اکنافِ عالم سے بیت اللہ شریف کا قصد کر کے چلتے ہیں۔ "اَمَّ ۔ یَؤُمُّ"

---

[۱] المائدہ ۲:

ہی سے لفظ "اُمّۃ" بنا ہے، یعنی ایسے لوگوں پر مشتمل اجتماعیت جن کا قصد ایک ہے، مقصد ایک ہے، ہدف ایک ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں اکثر نے اِس امّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غرضِ تاسیس اور اس کے مقصدِ وجود کے بارے میں کبھی غور بھی نہیں کیا۔ اس امّت کی رکنیت ہمیں پیدائشی طور پر ملی ہے۔ ہم مسلمان اس لیے بن گئے ہیں کہ ہم اللہ کے فضل سے مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو گئے اور اسلام کی یہ دولت ہمیں بغیر کسی ایثار و قربانی اور محنت و مشقت کے اور بغیر کوئی نقصان برداشت کیے ہوئے میسّر آ گئی۔ لہٰذا ہم نے اکثر و بیشتر کبھی یہ غور کرنے کی تکلیف تک نہیں کی کہ اس مسلمان ہونے کے تقاضے کیا ہیں! اس امّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس کیا ہے! یہ امّت آخر کیوں برپا کی گئی ہے! تو آئیے آج امّت کی اس غرضِ تاسیس کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھیے!

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے، قرآنِ حکیم نے اس کے لیے دو[۲] اصطلاحات استعمال کی ہیں:

ا۔ شہادت علی النّاس

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ: ۱۴۳)

" اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت (بہترین امت) بنایا، تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر ـــــ اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔"

قرآن حکیم کا ایک اصول میں نے بارہا بیان کیا ہے اور میرے دروس کی محافل میں شرکت کرنے والے حضرات نے مجھ سے کئی مرتبہ یہ بات سنی ہو گی کہ مطالعۂ قرآن اور اس پر غور و فکر کے دوران میں نے دیکھا ہے کہ قرآن حکیم میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون جو سورۃ البقرۃ میں دوسرے پارے کے آغاز میں آیا ہے، سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی وارد ہوا ہے، جہاں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا: وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ یعنی اللہ کے راستے میں جہاد کرو، محنت اور جدّ و جہد کرو، جیسا کہ اس کی جدّ و جہد کا حق ہے۔ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ: اس نے تمہیں چن لیا ہے، پسند کر لیا ہے۔ لیکن یہ چناؤ، یہ انتخاب کس لیے ہوا؟

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

"تاکہ رسول گواہ بن جائیں تم پر، اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوعِ انسانی پر!"

دونوں مقامات پر مضمون ایک ہی ہے، صرف ترتیب کا فرق ہے۔ سورۃ البقرہ میں امت کا ذکر پہلے ہے اور رسول اللہؐ کا ذکر بعد میں ——— جبکہ سورۃ الحج میں رسول اللہؐ کا ذکر پہلے ہے اور امت کا بعد میں۔

"شہادت علی الناس" اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر "اسلام کا فلسفۂ شہادت" کے عنوان سے میرے کیسٹ موجود ہیں۔ اس "شہادت علی الناس" کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ شہادت کسی کے حق میں ہوتی ہے اور کسی کے خلاف۔ آپ اگر کسی مقدمے میں بطورِ گواہ پیش ہوتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آپ کی گواہی ایک فریق کے حق میں جاتی ہے اور دوسرے کے خلاف جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں بھی گواہی کے یہ دونوں پہلو آتے ہیں۔ کسی کے حق میں گواہی کو "ل" کے ساتھ اور کسی کے خلاف گواہی کو "علیٰ" کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ "یعنی اے ایمان والو! اللہ کے حق میں گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ اپنی زبان اور اپنے عمل سے اللہ کی توحید اور اس کے دین کے گواہ بن جاؤ! تمہارا ہر عمل گواہی دے رہا ہو کہ تم اللہ کے ماننے والے ہو، تمہارا طرزِ عمل پکار پکار کر لوگوں کو بتا رہا ہو کہ یہ محمدؐ عربی کے نام لیوا ہیں۔ یہ گواہی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے، جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے ؏ دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی! لیکن یہ گواہی کسی کے خلاف بھی پڑ رہی ہے۔ آپ نے جب دنیا کے سامنے دین کی حقانیت اور محمدؐ رسول اللہ کی صداقت کی گواہی دے دی تو اب ان کے اوپر ایک گواہی قائم ہو گئی۔ اب قیامت کے دن وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکیں گے کہ اے اللہ ہمارے سامنے تو تیرا دین آیا ہی نہیں، ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ اللہ کیا چاہتا ہے، ہمیں تو کسی نے نہ تیرے ساتھ متعارف کرایا، نہ تیرے رسولؐ کے ساتھ اور نہ تیرے کلام کے ساتھ۔ یہ ہے لوگوں پر گواہی کا قائم ہو جانا جو قیامت کے دن ان کے خلاف پڑے گی۔ اس لیے کہ اگر لاعلمی ہو تو پھر بھی کوئی عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اے اللہ مجھے معلوم نہیں تھا ——— اگرچہ آپ کو معلوم

ہے کہ دنیا میں تو عدالت کا اصول یہ ہے کہ 'IGNORANCE OF LAW IS NO EXCUSE'
آپ کو اگر قانون معلوم نہیں ہے تو آپ عذر نہیں پیش کر سکتے۔ قانون چاہے آپ کے علم میں
ہو، چاہے نہ ہو، آپ قانون کی گرفت میں آئیں گے ـــــــ لیکن عدالتِ اُخروی میں معاملہ یہ
نہیں ہے۔ وہاں لاعلمی بھی ایک عذر کے درجے میں آجائے گی۔ لہٰذا اللہ رسولوں کو بھیجتا رہا تاکہ
لوگ لاعلمی کا عذر پیش نہ کر سکیں۔ رسُول اپنے قول و عمل اور کردار سے گواہی دے دیں کہ یہ ہے
دینِ حق، یہ ہے اللہ کا دیا ہوا راستہ جس پر میں چل کر دکھا رہا ہوں۔ یہ راستہ ناقابلِ عمل بھی نہیں
ہے، دیکھو میں تم جیسا انسان ہوں، مجھے بھی پیٹ لگا ہوا ہے، میری بھی احتیاجات ہیں، میرے
بھی بال بچے ہیں، زندگی کے تمام تقاضے میرے ساتھ بھی ہیں، پھر بھی میں اللہ کا بندہ بن کر
زندگی گزار رہا ہوں تو اس طرح سے لوگوں پر حجت قائم ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت انبیاء و رسل کے
مقصدِ بعثت کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین اصطلاح ہے۔

چونکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو رہا تھا، لہٰذا یہ ذمّہ داری اجتماعی طور
پر امّت کے سپرد کر دی گئی۔ اب انہیں اپنے قول و عمل سے انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ گواہی
دینی ہے ـــــ اور یہی امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ تاسیس ہے، بفحوائے الفاظ قرآنی:
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا[ط]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں لوگوں سے
گواہی لے لی: الا ھل بلّغتُ؟ "لوگو! میں نے پہنچا دیا؟" اور سوا لاکھ کے مجمع نے بیک زبان
کہا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ "ہاں حضورؐ، ہم گواہ ہیں، آپؐ نے
حقِ رسالت ادا کر دیا، حقِ امانت ادا کر دیا، حقِ نصیحت ادا کر دیا۔" پھر اللہ کی جناب میں عرض کیا:
اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ "اے اللہ تو بھی گواہ رہ!" اب میری ذمّہ داری ختم ہو گئی، میرا فرضِ منصبی
ادا ہو گیا ـــــ پھر لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ "پس اب
پہنچائیں وہ جو موجود ہیں ان کو جو موجود نہیں ہیں"۔ یعنی اب یہ ذمّہ داری میرے کندھوں سے اتر کر
تمہارے کندھوں پر آگئی ہے۔ اب تمہیں یہ پیغام چہار دانگِ عالم میں پہنچانا ہے، اس لیے کہ
میں صرف تمہارے لیے ہی رسول بن کر نہیں آیا تھا، بلکہ میں تو پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول

بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں تو تا قیامِ قیامت اللہ کا رسول ہوں۔ جتنے انسان اس وقت دنیا میں ہیں اور جتنے انسان تا قیامِ قیامت آئیں گے میں اُن سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اب یہ شہادت جو میں نے تم پر دی ہے، تمہیں دینی ہے پوری نوعِ انسانی پر!

بدقسمتی سے ہمارے ہاں لفظ شہادت کے صرف ایک ہی معنی عام ہو گئے، یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا ہی شہادت ہے۔ اور شہید کا صرف یہی ایک مفہوم رہ گیا کہ جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے۔ قرآن حکیم 'شاہد' اور 'شہید' کے الفاظ انبیاء و رسل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے تمام رسول شہید ہیں، حالانکہ رسول اللہ کی راہ میں قتل نہیں ہوتے۔ نبی ضرور قتل ہوتے ہیں، لیکن رسول کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود تمام رسول شہید ہیں۔ سب اللہ کے گواہ ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے عمل سے گواہی دیتے ہوئے بسر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا۔ (النساء : ۴۱)

"اُس دن کیا کیفیت ہو گی جبکہ ہم ہر امت پر ایک گواہ لا کھڑا کریں گے اور اے نبیؐ آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان پر!"

جس امّت کی طرف جو رسول بھیجے گئے وہ اُس عدالتِ اخروی میں شہادت دیں گے، TESTIFY کریں گے۔ رسول سرکاری گواہ (PROSECUTION WITNESS) کی حیثیت سے کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ تیرا دین اور تیرا پیغام جو مجھ تک آیا تھا میں نے ان تک پہنچا دیا تھا۔ اب یہ خود ذمّہ دار اور مسئول ہیں۔ اور پھر آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے اور اپنی امت کے بارے میں TESTIFY کریں گے کہ اے اللہ میں نے انہیں تیرا دین پہنچا دیا تھا۔ اب اپنے طرزِ عمل کے ذمّہ دار اور مسئول یہ خود ہیں۔ پھر امّتِ مسلمہ کو کھڑے ہو کر یہی شہادت دینا ہو گی۔ اور اگر نہ دے سکی تو وہ گویا کہ دوسروں سے پہلے مجرم ہو گی۔ دوسروں کو دین کا پیغام پہنچانا اس کے ذمہ تھا، اگر اس نے نہیں پہنچایا تو دوسروں کی نافرمانی اور گمراہی کا وبال بھی اس پر آئے گا۔

(۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس کے لیے قرآنِ حکیم میں آسان تر اصطلاح "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی اختیار کی گئی ہے۔ سورۃ آل عمران میں امت کی غرضِ تاسیس کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران آپس میں بہنیں ہیں یعنی یہ دونوں سورتیں ایک جوڑا ہیں۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

"تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم کرتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

دنیا کی قومیں اپنے لیے زندہ رہتی ہیں، اپنے لیے جدوجہد کرتی ہیں، اپنی ترقی، اپنی عظمت، اپنی سربلندی اور اپنے لیے قوت و سطوت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ لیکن اے مسلمانو تمہیں دنیا والوں کے لیے زندہ رہنا ہے۔ جیسے اقبال نے "شکوہ" میں کہا ہے ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے　　کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالے گئے ہو۔ تمہارا کام کیا ہے؟ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ نیکی کا حکم دو! وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اور بدی سے روکو! وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ اور اللہ پر ایمان پختہ رکھو!! یہاں اس بات کو پھر ذہن میں تازہ کیجیے کہ اہم مضمون قرآن حکیم میں کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں یہ مضمون اس انداز سے آیا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۰۴)

"اور تم میں ایک امت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

ان دو آیات کے مابین ربط ملاحظہ کیجیے۔ پہلی آیت صحابہ کرامؓ کو خطاب کر رہی ہے۔

صحابہ کرامؓ وہ حضرات تھے جن میں سے ایک ایک فرد کو یہ معلوم تھا کہ میرا فرضِ منصبی کیا ہے۔ میں کس لیے امّتِ محمدؐ میں شامل ہوا ہوں، بحیثیتِ امتی میری ذمہ داری کیا ہے۔ لہٰذا وہاں مجموعی طور پر امّت کو خطاب کیا گیا: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ . . . الخ یعنی اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) تم بہترین امّت ہو، بہترین جماعت ہو، پوری انسانی تاریخ کے اندر بہترین گروہ ہو، جو لوگوں کے لیے نکالے گئے ہو اُن کی بھلائی اور بہبود کے لیے' ان کی آخرت سنوارنے کے لیے' انہیں حق کی طرف بلانے کے لیے' انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے' انہیں ظلم وستم کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے۔ اور تمہارا تو فرضِ منصبی ہی نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہے! لیکن دوسری آیت درحقیقت اُس دَور کے لیے ہے جب امّت اپنے فرضِ منصبی کو بھول چکی ہو۔ جیسے مثلاً آج کا دَور ہے۔ آج ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم بھی ایک قوم ہیں جیسے دنیا میں اور قومیں ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد کو بھی اسی لیے جینا ہے اور دَوڑ بھاگ کرنی ہے جیسے کوئی ہندو، کوئی سکھ اور کوئی پارسی اپنی معاش کے لیے' اپنی اولاد کی پرورش کے لیے، اپنا گھر بنانے' اس کو سجانے اور ساز وسامان جمع کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ ہم نماز پڑھ لیتے ہیں' وہ جانا چاہے تو کسی مندر میں چلا جاتا ہے۔ اور ہم میں بھی نماز پڑھنے والے کتنے رہ گئے ہیں؟ پھر یہ کہ اجتماعی سطح پر جو اُن کے اہداف اور مقاصد ہیں وہی ہمارے مقاصد ہیں۔ ان کا بھی زور چلتا ہے تو وہ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، دوسروں کی زمینیں چھین لیتے ہیں، دوسروں کے حقوق غصب کر لیتے ہیں، ہمارا بھی داؤ لگتا ہے تو ہم بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا دورِ زوال کہ امت بھول گئی کہ ہماری غرضِ تاسیس کیا تھی، ہمارے مقاصد کیا تھے، ہمارا نصب العین کیا تھا!

اس دَورِ زوال کے لیے قرآن حکیم یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اس امت میں سے کچھ لوگ جو بیدار ہو جائیں، جو ہوش میں آ جائیں، جنہیں اپنا مقصدِ وجود یاد آ جائے وہ دوسروں کو جگائیں! بچوں کے لیے 'ہمدرد' کا جو رسالہ 'نونہال' نکلتا ہے اس میں آپ نے ایک عنوان دیکھا ہوگا "جاگو اور جگاؤ"! مجھے یہ SLOGAN بہت پسند ہے۔ یہ بڑی اچھی اور عام فہم اصطلاح ہے۔ خود جاگو! اور جو جاگ جائیں وہ دوسروں کو جگائیں، خوابِ غفلت سے بیدار کریں۔ جنہیں یہ ہوش آ گیا ہے کہ

میں مسلمان ہوں، یہ میری ذمّہ داری ہے، میں تو بحیثیّتِ مجموعی اُس امّت کا فرد ہوں جو دنیا والوں کی بھلائی کے لیے برپا کی گئی ہے، میرے ذمّے تو بڑا عظیم فریضہ ہے، ایسا فریضہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے سپرد کرتا رہا ہے ـــــــ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ، یہ اب دوسروں کو جگائیں۔ اس طرح جو جاگتے جائیں وہ ایک امّت بن جائیں، امّت میں ایک چھوٹی امّت ـــــــ جیسے آپ کہتے ہیں 'PARTY WITHIN PARTY' اور 'STATE WITHIN STATE' ایک تو بڑی امّت ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امّتی اس وقت دنیا میں ایک ارب سے زیادہ کی تعداد میں ہیں، لیکن سوئے ہوئے ہیں۔ کس اعتبار سے سوئے ہیں ؟ دنیا کے اعتبار سے سوئے ہوئے نہیں ہیں، ہر شخص اپنی بہتری کے لیے کوشاں ہے، زور لگا رہا ہے، دن رات محنت کر رہا ہے۔ البتہ دین کے اعتبار سے سو گئے ہیں۔ بحیثیّتِ امّتِ محمدؐ جو ذمّہ داری تھی، اس کے اعتبار سے سو گئے ہیں۔ تو جو جاگ جائیں وہ اِن سونے والوں کو جگائیں۔ اور آپس میں مل جُل کر اس بڑی امّت میں ایک چھوٹی امّت بنائیں۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ "تم میں سے ایک امّت تو ایسی لازماً ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے"۔ اور اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور پر نوٹ کیجیے: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "اور یہ جان لو کہ صرف وہی ہوں گے فلاح پانے والے"۔ یہ سوتے ہوتے فلاح نہیں پائیں گے۔ جو جاگ جائیں گے اور دوسروں کو جگائیں گے اور جو اپنے اس دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرضِ منصبی کو ادا کریں گے، صرف وہ ہوں گے فلاح پانے والے۔ آپ صدقِ دل سے دعا کیجیے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ اے اللہ ہمیں بھی ایسے لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرما!

اُمر بالمعروف اور نہی عن المنکر

لازم و ملزوم ہیں

قرآن حکیم ’امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘ کو ایک وحدت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان کی حیثیت ایک حیاتیاتی اکائی (ORGANIC WHOLE) کی سی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے اس دَور میں بہت سے انتہائی نیک اور نیک نیت لوگ، جو دین کے لیے حرکت اور جدّ و جہد بھی کر رہے ہیں، جو اپنے گھروں سے دین کی محنت کیلئے نکلتے ہیں، ایک مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ صرف نیکی کی تلقین کفایت کرتی ہے، نہی عن المنکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ کسی پر تنقید کا کوئی فائدہ نہیں، بھلائی کو پھیلاؤ، بھلائی کی تلقین کرو، جب بھلائی پھیلے گی تو بدی خود بخود رفع ہو جائے گی۔ بعض اعتبارات سے یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ تم روشنی پھیلاؤ، تاریکی خود بخود کافور ہوتی چلی جائیگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اور دینی اعتبار سے بہت بڑی غلط فہمی ہے جس میں یہ حضرات گرفتار ہیں۔ ان کا مجاہدانہ کردار اور دین کے لیے ان کی محنتیں مسلّم ہیں۔ ان حضرات کے دم قدم سے دین کے نام پر پوری دنیا میں ایک بہت بڑی حرکت موجود ہے۔ ان کے بیس بیس اور پچیس پچیس لاکھ کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی نیک نیتی سے اپنا وقت اور مال خرچ کرتے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے ’نہی عن المنکر‘ کا معاملہ معطّل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج آپ قرآن حکیم کے ۹ مقامات کے حوالے سے اس بات کو سمجھ لیں اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں، یہ ایک گاڑی کے ۲ پہیے یا ایک ہی تصویر کے ۲ رُخ ہیں۔ آپ دو پہیوں والی گاڑی کو ایک پہیے پر چلائیں گے تو وہ آگے نہیں بڑھے گی، وہ اپنے AXIS پر گھوم جائے گی اور چکّر لگائے گی۔ گاڑی دو پہیوں پر ہی آگے بڑھتی ہے۔ ان دونوں کو جُدا کرنا حکمت قرآنی اور منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔ میں انتہائی ادب کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی یہ

کہے کہ قرآن مجید تو یہ دو چیزیں بیان کر رہا ہے، لیکن اصل میں تو ایک ہی چیز ضروری ہے تو معلوم یہ ہوا کہ اس نے قرآن مجید پر طعن کیا ہے، گویا کہ اللہ کے کلام میں نقص نکالا ہے کہ شاید یہ صرف شاعری ہو رہی ہے، محض لفاظی ہو رہی ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ قرآن اگر ان دونوں چیزوں کو ایک یکجا اصطلاح کے طور پر لا رہا ہے تو وہ بلا مقصد نہیں لا رہا۔

اب ہم ان نو مقامات کا ایک ایک کر کے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر مقام کے لیے میں نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

۱۔ شانِ باری تعالےٰ ــــــــ النحل: ۹۰

یہ آیۂ مبارکہ آپ میں سے ہر شخص کو یاد ہوگی، کیونکہ ہر خطبۂ جمعہ کے اختتام پر آپ یہ آیت سنتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ج یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ہ

"یقیناً اللہ تعالےٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور قرابت داروں کا حق ادا کرنے کا ـــــ اور روکتا ہے بے حیائی سے، برائی سے اور سرکشی سے۔ تم کو سمجھاتا ہے، تاکہ تم یاد رکھو۔"

یہ آیۂ مبارکہ اللہ تعالےٰ کی یہ شان بیان کر رہی ہے کہ وہ خود نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ یہ آیت شریعت کے لیے ایک SYMBOL کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ شریعت نام ہی اوامر و نواہی کا ہے۔ اس آیت میں کس قدر خوبصورت توازن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کا حکم دیا اور تین باتوں سے روکا۔ حسنِ توازن کے ساتھ ساتھ اس میں حسنِ ترتیب بھی ہے۔ اس وقت ان آیات کا درس یا تفسیر مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ حقیقت آپ کے پیشِ نظر رہے کہ امر اور نہی دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ اللہ اگر نیکیوں کا حکم دیتا ہے تو بدیوں سے روکتا بھی ہے۔ ورنہ اگر وہ فلسفہ درست ہو تا کہ محض نیکی کی تلقین سے بدی خود بخود ملیامیٹ ہو جاتے گی تو بدی کی نشاندہی کر کے اس سے روکنے کی اضافی طور پر ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ تقاضائے فطرت و حکمت ــــ لقمٰن: ۱۷

حضرت لقمان کے بارے میں آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ وہ نہ نبی تھے، نہ کسی نبی کے امتی تھے۔ وہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل حکیم و دانا انسان تھے۔ انہوں نے اپنے غور و فکر سے جو نتائج اخذ کیے ان کی جھلک ان کی نصیحتوں میں ملتی ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ لقمان کا دوسرا رکوع ان کی ان وصیتوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ ان وصیتوں کا آغاز اس آیۂ مبارکہ سے ہوتا ہے: وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ۔ اس طرح قرآن حکیم نے حضرت لقمان کو امر بنا دیا ہے، اس لیے کہ جب تک قرآن موجود ہے اُن کا ذکر موجود ہے۔ اور قرآن تو ہمیشہ رہے گا، لہٰذا ان کا ذکر بھی ہمیشہ موجود رہے گا۔ تو اللہ نے اس انداز سے اپنے اُس بندے کی شان بڑھائی ہے۔ قرآن مجید میں اس طریقے سے تعین کے ساتھ یا تو رسولوں کا نام آتا ہے یا صحابہ کرامؓ میں سے حضرت زیدؓ کا نام آیا ہے۔ صحابہؓ حضرت زیدؓ کا ذکر خاص طور پر اس اعتبار سے کیا کرتے تھے کہ یہ کس قدر خوش قسمت ہیں کہ ان کا نام قرآن میں آیا ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا... الخ کے حوالے سے لوگ رشک سے کہا کرتے تھے کہ زیدؓ، تمہارا نام قرآن میں آیا ہے۔ ایسے ہی حضرت لقمان کا نام قرآن میں آکر دوام حاصل کر گیا۔ یہ حکیم و دانا انسان اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی روشنی میں بڑی بڑی حقیقتوں تک رسائی حاصل کر گئے۔ اسی لیے میں نے یہاں عنوان قائم کیا ہے "تقاضائے فطرت و حکمت"۔ قرآن حکیم میں ان کی وصیت نقل فرمائی گئی:

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

"اے میرے بچے، نماز قائم رکھ، نیکی کا حکم دے، بدی سے روک، اور پھر صبر کر اُس پر جو تجھ پر بیتے! بے شک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے"

دیکھیے، کتنی پیاری بات ہے۔ نیکی کی تلقین پر کبھی آپ کو کسی ردِّعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لوگ سُن لیں گے، مانیں یا نہ مانیں۔ آپ کسی سے کہیں کہ بھئی، بھلا کام کیا کرو، نماز پڑھا کرو، روزہ رکھا کرو تو اس پر کوئی پلٹ کر آپ کو گالی نہیں دے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جیسے چکنے گھڑے

پر پانی پڑتا ہے تو پھسل جاتا ہے، اس طرح لوگ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیں ـــــــ لیکن اصل میں لوگوں کی طرف سے جوابی کارروائی اُس وقت ہوتی ہے جب آپ انہیں بدی سے روکیں۔ اُس وقت پھر RESENTMENT اور RETALIATION ہوتی ہے۔ آپ چھوٹے سے بچّے سے یہ کہہ کر دیکھیے کہ "بیٹے یہ کھیلنے کی جگہ نہیں ہے، یہ کرکٹ کا میدان نہیں ہے، یہ سڑک ہے، تمہاری گیند کسی کا سر پھوڑ دے گی، کسی کی گاڑی کا شیشہ ٹوٹ جائے گا ـــــــ" لیکن یہ کہہ کر پھر وہاں سے آپ کا اپنی عزّت کو سالم لے کر واپس چلا آنا آسان نہیں ہو گا۔ اس طرح کی چھوٹی سے چھوٹی بات کسی سے کہہ کر دیکھ لیجئے، وہ اسے برداشت نہیں کرے گا۔ اسی لیے حضرت لقمان نے فرمایا: وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ ـــــــ یعنی بدی سے روکنے پر جو تجھ پر بیتے پھر اسے جھیل، اس پر صبر کر! یہی تو ربط ہے سورۃ العصر کے مضامین میں کہ 'وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ' کے ساتھ 'وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ' کا حکم بھی دیا گیا۔ حق کی وصیّت کر کے ظاہر بات ہے کہ پھر آپ کو صبر کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔

۳۔ شانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـــــــ الاعراف: ۱۵۷

اس آیۂ مبارکہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت موسٰی علیہ السلام کو اللہ تعالٰی نے تیس راتوں کے لیے کوہِ طُور پر بلالیا، اور پھر اس مدّت کو بڑھا کر چالیس راتیں کیا گیا، تو ان کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ اس پر حکم دیا گیا کہ ہر قبیلے میں سے جو لوگ توحید پر قائم رہے وہ اپنے اُن رشتہ داروں کو ذبح کریں جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا، جنہوں نے اسلام لانے کے بعد اور نبیؑ کے ساتھی ہونے کے بعد گائے کی پرستش کی۔ ان کے لیے توبہ کی یہ صُورت مقرّر کی گئی۔ چنانچہ تاریخ انسانی کی اس سب سے بڑی توبہ میں، جسے آج کی اصطلاح میں 'PURGE' کہا جا سکتا ہے، سترّ ہزار یہودی قتل کیے گئے۔ اس کے بعد موسٰی علیہ السلام سترّ سرکردہ لوگوں کو لے کر کوہِ طُور پر حاضر ہوتے اور دعا کی کہ پروردگار! ہم سے خطا ہو گئی ہے، تو معاف فرما دے، اور ہمارے لیے رحمت کا فیصلہ فرما دے! اس کا جواب دیا گیا: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ الخ۔ یعنی ایک تو میری رحمتِ عام ہے جو ہر شے کو محیط ہے لیکن ایک میری خاص رحمت ہے جو میں نے لکھ دی ہے اپنے اُن پرہیزگار بندوں کے لیے جو میرے رسُولِ نبیّ امّی (صلی اللہ

علیہ وسلم) پر ایمان لائیں گے۔ (اللہ کرے کہ میں اور آپ اُن لوگوں میں شامل ہو جائیں۔) اس آیۂ مبارکہ میں ان نیک بندوں کا ذکر اور رسول نبیِّ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان ہوتی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔الخ

"وہ لوگ کہ جو پیروی کریں گے میرے رسولِ نبیِّ اُمّی کی جس کو وہ موجود پائیں گے اپنے پاس لکھا ہوا تورات اور انجیل میں۔ (وہ نبیؐ) انہیں نیکیوں کا حکم دیں گے، بدی سے روکیں گے، ان کے لیے طیب چیزوں کو حلال ٹھہرائیں گے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہرائیں گے"۔

رسول نبیِّ امّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ مبارک کے بیان میں پہلی چیز وہی گاڑی کے دو پہیے ہیں: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

۴۔ شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم ——— التوبہ: ۷۱

آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں درجہ بدرجہ ایک ایک سیڑھی اتر رہا ہوں —— سب سے اُوپر شانِ باری تعالیٰ، دوسرے نمبر پر فطرتِ سلیمہ جس کے لیے قرآن حکیم میں الفاظ آتے ہیں: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ تیسرے نمبر پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اب چوتھے نمبر پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ سورۃ التوبہ میں صحابہؓ کی شان یہ بیان فرمائی گئی:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ الخ

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں . . ."

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔

۵۔ کیفیتِ منافقین ——— التوبہ: ۶۷

شانِ صحابہؓ کا 'CONVERSE' منافقین کی کیفیت میں دیکھا جاسکتا ہے سورۃ التوبہ

ہی کی آیت ۶۷ میں کیفیتِ منافقین اِن الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ الخ

"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے میں سے ہیں۔ (یہ ایک دوسرے کے ساتھی، مددگار اور پشت پناہ ہیں)۔ یہ نیکی سے روکتے ہیں اور بدی کا حکم دیتے ہیں..."

معلوم ہوا کہ آپ اس عمل کو معکوس بھی کر دیں تو بھی یہ ایک وحدت ہی رہے گا۔ آپ انہیں تقسیم نہیں کر سکتے۔ یا تو کردار وہ ہو گا کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ـــــ اور یا پھر کردار یہ ہو جائے گا کہ بدی کا حکم دینا اور نیکی سے روکنا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: كَيْفَ بِكُمْ إِذَا لَمْ تَأْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ؟ "تم لوگوں کا کیا حال ہو گا جب تم نیکی کا حکم دینا چھوڑ دو گے اور بدی سے روکنا چھوڑ دو گے؟" صحابہؓ حیران ہوئے۔ ان کے لیے تو یہ ناقابلِ قیاس اور ناقابلِ گمان بات تھی۔ انہوں نے کہا: 'يَا رَسُوْلَ اللهِ وَاِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ؟' "اے اللہ کے رسولؐ! کیا ایسا بھی ہونے والا ہے؟" آپ نے فرمایا: نَعَمْ، وَاَشَدُّ، كَيْفَ بِكُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْكَرِ وَنَهَيْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ؟ "ہاں، (تم اِسی پر حیران ہو رہے ہو میرے صحابہؓ!) اس سے بھی شدید کیفیت پیدا ہو جائے گی، اور اُس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تم بدی کا حکم دو گے اور نیکی سے روکو گے!" یہ وہ کیفیت ہے جو قرآن حکیم میں منافقین کی بیان فرمائی گئی۔ گویا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا جب میری امت میں نفاق عام ہو جائے گا۔ آج آپ کا معاشرہ یہی تصویر پیش کرتا ہے۔ نیکی کے راستے پر چلنا بہت مشکل ہے، جبکہ بدی کے راستے کشادہ ہیں اور ان پر کوئی مزاحمت نہیں۔ کوئی نوجوان ذرا داڑھی رکھ لے تو تمام رشتہ دار، اعزّہ و اقارب حتیٰ کہ والدین سب اسے طعن و تشنیع کا ہدف بنائیں گے کہ تم نے یہ کیا کیا؟ ذرا گھر میں شرعی پردہ نافذ کر کے دیکھیے، آپ اپنے معاشرے سے نکال دیئے جائیں گے، آپ کا تعلق آپ کے عزیزوں سے کٹ جائے گا۔ اب ذرا اسی حدیث کا آخری ٹکڑا ملاحظہ کیجیے۔ جب صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کی اس پیشگوئی پر مزید تعجب کا اظہار کیا کہ یا رسول اللہ، کیا ایسا بھی ہونے والا ہے؟ تو

آپؐ نے فرمایا: نَعَمْ، وَاَشَدُّ، کَیْفَ بِکُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا۔
"ہاں، بلکہ معاملہ اس سے بھی شدید تر ہوگا، اور اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کو بدی جاننے لگو گے اور بدی کو نیکی سمجھنے لگ جاؤ گے"! یعنی میری امّت پر ایسا دور بھی آنے والا ہے جب خیر و شر کی تمیز تک ختم ہو جائے گی۔ نیکی کو بدی سمجھا جائے گا اور بدی لوگوں کو نیکی دکھائی دے گی۔ اللّٰھم ربّنا لا تجعلنا معھم !!

۶۔ امّت کا فرضِ منصبی ـــــــــ آلِ عمران: ۱۱۰

اس آیۂ مبارکہ کا مطالعہ ہم پہلے ہی "امّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس" کے ضمن میں قدرے وضاحت کے ساتھ کر چکے ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ

"تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

۷۔ دورِ زوال میں امّتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل کا نقطۂ عروج ـــ آلِ عمران: ۱۰۴

سورۃ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں 'امّتِ مسلمہ کے لیے لائحہ عمل' کے موضوع پر میں نے آپ کے اسی شہر کراچی میں ایک مسجد میں آج سے چار سال قبل ایک مفصّل خطاب کیا تھا۔ اس میں میں نے واضح کیا تھا کہ بگڑے ہوئے موجودہ حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے صورتِ حال کس طریقے سے تبدیل ہو، اس کے لیے قرآن ہمیں کیا لائحہ عمل دیتا ہے۔ قرآن مجید تو ہمیشہ کے لیے ہدایت و رہنمائی ہے۔ اس نے اُس دَور کے لیے بھی ہدایت فراہم کی جس میں یہ نازل ہوا اور بعد والے ادوار کے لیے بھی ہدایت و رہنمائی دی ہے۔ چنانچہ اس دورِ زوال میں اگر ہمیں اوپر اُٹھنے کے لیے لائحہ عمل درکار ہے تو بھی ہمیں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ قرآن مجید نے مذکورہ تین آیات میں ایک سہ نکاتی لائحہ عمل دیا ہے، جس میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص تقویٰ اختیار کرے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مل جل کر اللہ کی رسّی یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے

تھام لو اور بنیانِ مرصوص بن جاؤ، اور اس کا تیسرا نکتہ اور ذروۂ سنام یہ ہے کہ تم میں ایک جماعت تو ایسی قائم ہونی چاہیے جو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"تم میں سے ایک جماعت تو لازماً ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے ——— اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"

قرآن نے جس جماعت کی ضرورت پر زور دیا ہے اس کے کرنے کے بس تین کام ہی بتائے ہیں ——— (۱) خیر کی طرف دعوت (۲) نیکی کا حکم اور (۳) بدی سے روکنا۔ میں یہاں پر عرض کر دوں کہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری دینی جماعتیں بھی اپنے اصل ہدف سے ہٹ چکی ہیں۔ اپنے آپ کو پاور پالیٹکس میں ملوّث کر لینا، کبھی کسی کا پاسنگ اور کبھی کسی کا ضمیمہ بن جانا اور سیاسی اعتبارات سے اِدھر سے اُدھر لڑھکتے پھرنا، یہ سب درحقیقت اپنے اصل ہدف سے ہٹ جانے کی بنا پر ہے۔

ع آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

مذکورہ بالا تین آیات کی روشنی میں مَیں نے جو تقریر ۱۹۸۵ء میں یہاں کی تھی، اسے بھائی جمیل الرحمٰن صاحب نے ٹیپ سے اُتار لیا تھا اور اب وہ "مسلمانوں کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل" کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ (اللہ تعالیٰ بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کو جزائے خیر دے کہ میری بہت سی تقریریں انہی کے ذریعہ سے کتابی شکل میں آئی ہیں) یہ ایسا کتابچہ ہے جسے بڑے پیمانے پر عام کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے ہمیں جو لائحہ عمل دیا ہے اسے اپنائے بغیر اس قعرِ مذلت سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ غزوۂ حنین کے موقع پر جب آنحضورؐ اپنے جاں نثار صحابہؓ کے ساتھ ایک تنگ پہاڑی درّے سے گزر رہے تھے تو وہاں پہلے سے موجود کفار کی جانب سے تیروں کی اچانک بوچھاڑ سے ایک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آواز بلند کی: اِلَیَّ یا عبادَ اللّٰہ، اِلَیَّ یا عباد اللہ! اے

اللہ کے بندو، کدھر جا رہے ہو؟ میری طرف آؤ! آج قرآن یہی پکار لگا رہا ہے: اِلَیَّ یا عباد اللہ! آؤ، میری طرف آؤ! ع سوئے مادر آ کہ تیمارت کند! قرآن پکار رہا ہے کہ آؤ، میرے پاس پروگرام اور لائحہ عمل ہے، میرے پاس ہدایت ہے ـــــ لیکن تم نے مجھے اپنا امام بنایا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کتابچے کا انتساب اُن باہمت افراد کے نام کیا ہے جو قرآن حکیم کو واقعتاً اپنا امام اور رہنما بنانے کا فیصلہ کر لیں!

۸۔ اصحابِ اقتدار کا فرضِ عین ـــــ الحج: ۴۱

اِس سلسلے کا آٹھواں مقام سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ پر مشتمل ہے، جہاں ایک اسلامی حکومت کے اربابِ اختیار و اقتدار کے بنیادی اور اہم ترین فرائض گنوائے گئے ہیں:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝

”وہ لوگ کہ جنہیں اگر ہم زمین میں اختیار و اقتدار عطا فرما دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے ۔۔۔۔“

یہ آیات اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ یہ اُس وقت نازل ہوئیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرماتے ہوئے مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے، جہاں ایک اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آنا تھا۔ تو یہ گویا کہ ”حزب اللہ“ کا منشور (MENIFESTO) ہے کہ وہ لوگ جو حقیقتاً ایمان اور اسلام پر عمل پیرا اور کاربند ہوں، انہیں اگر اللہ اقتدار عطا فرما دے تو وہ کیا کریں گے! یہاں بھی نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ زکوٰۃ کے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ’امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘ کا ذکر ایک وحدت کے طور پر کیا گیا ہے۔

۹۔ سرفروش اور جانباز اہلِ ایمان کے اوصاف کا ذروۂ سنام ـــــ التوبہ: ۱۱۱، ۱۱۲

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ

وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ اَلتَّاۗىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّاۗىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اللہ نے اہلِ ایمان سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنّت ہے ۔ (لہٰذا) وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ (جنّت کا یہ) وعدہ حق ہے، اسؔ کے ذمّے ہے۔ (اللہ نے اس وعدے کی توثیق کی ہے) تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اپنی اس تجارت پر جو تم نے اس سے کی ہے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی۔ (ان کے اوصاف یہ ہیں کہ) وہ توبہ کرنے والے ہیں، (اللہ کی) بندگی کرنے والے، حمد کرنے والے، (لذاتِ دنیوی سے) کنارہ کشی کرنے والے، (اللہ کی بارگاہ میں) رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور (اے نبی) خوشخبری سنا دیں اہلِ ایمان کو۔"

اِن آیات کا آغاز ہوتا ہے کہ اللہ نے تو اہلِ ایمان سے اُن کی جانیں اور ان کے مال جنّت کے عوض خرید لیے ہیں۔ یعنی جو بھی باشعور صاحبِ ایمان ہے وہ گویا اللہ کے ساتھ ایک بیع و شراء کر چکا، اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکا —— لہٰذا اسی کا مظہر یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ سرفروشی اور جاں فشانی کے پیکر تھے۔ جب بھی انہیں پکارا گیا جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ ہم بھی اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کریں اور تمنّا یہ رکھیں کہ اس راہ میں جان تک قربان کر دیں گے، جیسے حضورؐ نے فرمایا: لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ" یعنی میری بڑی خواہش اور آرزو ہے کہ میں اللہ

ثُمَّ اُقتَلُ، ثُمَّ اُحیَا، ثُمَّ اُقتَلُ"[1] یعنی میری بڑی خواہش اور آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں پھر مجھے زندہ کیا جائے پھر قتل کیا جائے پھر زندہ کیا جائے اور پھر قتل کیا جائے۔ تو اللہ کرے کہ یہ خواہش ہمارے دلوں میں بھی آ جائے۔ لیکن اس خواہش کے ساتھ ساتھ کچھ اوصاف اپنے اندر پیدا کرنا ہوں گے۔ وہ اوصاف کیا ہیں:

التائبون۔ العابدون۔ الحامدون۔ السائحون۔ الراکعون۔ الساجدون۔ الاٰمرون بالمعروف۔ والناھون عن المنکر۔ والحافظون لحدود اللہ۔ یعنی (۱) توبہ کرنے والے، رجوع کرنے والے۔ خطا یا غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کریں۔ (۲) اللہ کے عبادت گزار۔ اس کے اطاعت شعار، اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا اصول بنا لینے والے۔ (۳) اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنے والے۔ (۴) لذّاتِ دنیوی سے کنارہ کشی کر لینے والے۔ (۵) اللہ کی جناب میں رکوع کرنے والے۔ (۶) اللہ کی بارگاہ میں سجدے کرنے والے۔ (۷) نیکی کا حکم دینے والے (۸) اور بدی سے روکنے والے۔ (۹) اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور آخر میں فرمایا گیا کہ اے نبی، ایسے اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجئے جنہوں نے اپنی جانیں اور مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے اور اس کے بعد ان کی زندگی کے شب و روز کا نقشہ اُوپر بیان کردہ آیت کے مطابق ہے۔ انہیں ان کی کامیابی کی خوشخبری سنا دیجئے!!

یہ مقام اس اعتبار سے ذروۂ سنام ہے کہ یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بھی اگلا قدم بیان کر دیا گیا: اَلحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰہِ۔ حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔ اور موجودہ دَور میں اسلامی انقلاب کے لیے 'اقدام' کا مرحلہ یہی ہو گا۔ سنّتِ نبوی، سیرتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے ہمیں انقلاب کے چھ مراحل ملتے ہیں ——(۱) دعوت (۲) تنظیم (۳) تربیت (۴) صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) (۵) اقدام (ACTIVE RESISTANCE) اور (۶) مسلّح تصادم۔ موجودہ حالات میں "مسلح تصادم" کے بجائے "اقدام" کا طریقہ یہ ہو گا کہ انقلاب کے کارکن میدان میں نکل کھڑے ہوں کہ ہم اللہ کی حدود کو توڑنے نہیں دیں گے۔ یہ نہی عن المنکر

---

[1] رواہ البخاری، عن ابی ہریرۃؓ۔

بالید کا ایک انداز ہے۔ وہ طاقت کے ساتھ چیلنج کر دیں اور منکرات کے مقابلے میں دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں کہ اب ہم جیتے جی یہ نہیں ہونے دیں گے! اب یہ ہماری لاشوں پر ہی ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی فوج جس پر آپ کے بجٹ کا بہت بڑا حصّہ صرف ہوتا ہے، اس کا مقصد کیا ہے۔ یہ کہ وطنِ عزیز کی سرحدوں کے محافظ بن کر کھڑے ہو جائیں۔ جان دے دیں لیکن اس سرزمین کا ایک اپنچ بھی دشمن کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ ابھی تقریباً بیس کروڑ روپیہ "ضربِ مومن" پر اسی لیے تو خرچ ہوا ہے کہ ہماری افواج چاق و چوبند رہیں اور ہر طرح کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہوں، کہیں وقت آنے پر سُست پڑے ہوئے نہ ہوں۔ یہ سب کس لیے ہے؟ حدودِ ارضی کی حفاظت کے لیے، وطن کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کے لیے! لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ اس ملک کی نظریاتی حدود بھی ہیں۔ وہ نظریاتی حدود "حدود اللہ" ہیں، جن کی ہمیں حفاظت کرنی ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ـــــ "دیکھو، یہ اللہ کی حدود ہیں، ان کے قریب بھی نہ پھٹکو!" کہیں یوں فرمایا گیا: ..... فَلَا تَعْتَدُوْهَا ـــــ "یہ اللہ کی حدود ہیں، انہیں پامال نہ کرو، ان سے تجاوز نہ کرو!"۔ اب اللہ کا وہ سرفروش بندہ جو جان اور مال اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہو اس کے اوصاف کی چوٹی درحقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی حدود کا محافظ بن کر کھڑا ہو جاتے کہ میرے جیتے جی اللہ کی یہ حد پامال نہیں کی جائے گی۔ میں زندہ رہوں اور اللہ کی حدود پامال کر دی جائیں، یہ نہیں ہوگا! اس موقع پر مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یاد آ گئے ہیں۔ انہوں نے یہی فرمایا تھا: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ "کیا دین کے اندر تغیّر کر دیا جائے گا، جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟" آپ رضؓ کے دورِ خلافت میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کچھ حضرات نے مشورہ دیا تھا کہ آپ یہ اتنے سارے محاذ ایک دم نہ کھول لیجئے۔ ایک طرف مدّعیانِ نبوّت ہیں۔ وہ تو کھلم کھلا مرتد ہیں۔ ٹھیک ہے ان کے خلاف تو اقدام کیجئے لیکن یہ مانعینِ زکوٰۃ تو کلمہ گو ہیں، انہوں نے کسی نئے نبی کو بھی تسلیم نہیں کیا ہے، آپ ان کے خلاف محاذ نہ کھولیے، اس لیے کہ اس وقت حالات بڑے مخدوش ہیں ـــــ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ "کیا دین کے اندر تبدیلی کر دی

جائے گی، اس حال میں کہ میں زندہ ہوں ہے" آپؓ افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق یونہی تو نہیں بن گئے تھے۔ یہ رتبۂ بلند یونہی تو نہیں مل گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپؓ کو مشورہ دیا تھا کہ اس وقت حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ ایک طرف جیشِ اسامہؓ کو بھی نہیں روک رہے سلطنتِ روم کے ساتھ ٹکراؤ اس دلیل پر جاری رکھ رہے ہیں کہ حضورؐ نے جو جھنڈا باندھ دیا تھا میں اسے کیسے کھول دوں، حضورؐ نے جو لشکر تیار کر دیا تھا اب اسے کیسے روک دیا جائے! اگر یہ تمام محاذ بیک وقت کھول دیئے گئے تو یہاں مدینہ منورہ میں محافظ کون ہوں گے؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا کہ اگر کوئی محافظ نہ ہو اور درندے آکر ابوبکر کو نوچیں تب بھی یہ کام ہو کر رہے گا۔ اس لیے کہ میں اللہ کے رسولؐ کا خلیفہ ہوں۔ میرا مقصدِ زندگی ان کے مشن کی تکمیل ہے۔ یہ ہے حفاظتِ حدود اللہ! تو یہ جو یہاں نو ۹ اوصاف بیان ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں سے ایک ایک وصف اپنے اندر جذب کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

میری اس گفتگو میں اگرچہ کئی دوسرے مضامین بھی ضمنی طور پر آ گئے، لیکن اس سے میرا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ناقابلِ تقسیم (INSEPERABLE) ہیں۔ قرآن مجید اگر نو مقامات پر انہیں متوازن (BALANCED) طریقے سے اجزائے لاینفک کی حیثیت سے بیان کر رہا ہے تو ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی ایک کو غیر ضروری یا اضافی قرار دے۔ اس سلسلے میں غلط فہمی رفع ہونی چاہیے۔ یہ مغالطہ جنہیں بھی ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس مغالطے پر متنبہ اور مطلع ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

پس نوشت

'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کے باہمی لزوم کے ضمن میں قرآن حکیم کے متذکرہ بالا نو ۹ مقامات کے علاوہ "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" کے مصداق دسواں مقام سورۃ آل عمران کی آیات ۱۱۳، ۱۱۴ میں اہل کتاب کے صالح لوگوں کے اوصاف کے سلسلے میں وارد ہوا ہے: "لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَأُولٰئِكَ مِنَ الصّٰلِحِينَ ۝"

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

اور

علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام

اب تک میں نے دو باتیں عرض کی ہیں ـــــ ایک یہ کہ امّتِ مسلمہ کی غرضِ تأسیس کے لیے قرآن حکیم کی اصطلاحات دو ہیں: شہادت[۱] علی الناس اور امر[۲] بالمعروف و نہی عن المنکر۔ اور دوسری یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اب ہم تیسری بحث کی طرف آتے ہیں کہ ان دونوں میں اہم تر 'نہی عن المنکر' ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعدد اضافی مقامات ایسے ہیں جہاں صرف نہی عن المنکر کا بیان ہے۔ ہمارے اصولِ فقہ میں بھی یہ اصول ہے کہ 'نہی' بہ نسبت 'امر' کے زیادہ زوردار اور مؤثر ہے۔ مثال کے طور پر دو حدیثوں کو لیجئے۔ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں سے جب بھی کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت 'تحیۃ المسجد' ادا کرلے[۱]۔ دوسری حدیث میں یہ ہے کہ عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک کوئی نماز نہیں ہے[۲]۔ اب اگر کوئی شخص عصر کے بعد مسجد میں آئے تو وہ کیا کرے؟ ہمارے فقہاء اس مسئلے میں نہی کو امر کی نسبت مقدم سمجھتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عصر کے بعد غروبِ آفتاب سے پہلے مسجد میں آتا ہے تو وہ تحیۃ المسجد ادا نہیں کرے گا۔

قرآن و حدیث کی رُو سے خاص طور پر علماء اور صوفیاء کے کرنے کا اصل کام یہی 'نہی عن المنکر' ہے اور عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ بھی یہی ہے۔ اس کے ضمن میں ہم قرآنِ حکیم کی چند آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین احادیث کا مطالعہ کریں گے۔

۱ـ اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَرْکَعْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ یَّجْلِسَ (متفق علیہ: عن ابی قتادۃ)

۲ـ لَاصَلٰوۃَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰی تَغِیْبَ الشَّمْسُ (متفق علیہ: عن ابی سعید الخدری)

قرآن حکیم میں اہلِ کتاب کے جو حالات وارد ہوئے ہیں اُن کی حیثیت درحقیقت ایک آئینے کی سی ہے جو مسلمانوں کو دکھایا جا رہا ہے۔ میری تقاریر اور مضامین میں بنی اسرائیل کے بارے میں بارہا اس حدیث کا حوالہ آیا ہے کہ حضورؐ نے خبر دی تھی کہ میری امّت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ میری امّت میں بھی وہ ساری خرابیاں پیدا ہوں گی جو اُن میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ اگر اُن میں کوئی بدبخت ایسا اٹھا تھا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا ہو تو میری امّت میں سے بھی کوئی نہ کوئی ایسا پیدا ہو گا جو یہ حرکتِ شنیع کرے گا[ل]۔ اسی کے حوالے سے قرآن حکیم نے بنی اسرائیل پر جو تنقید کی ہے اس کو پڑھیے۔

علماءِ یہود پر قرآن کی تنقید

سورۃ المائدہ کی آیات ۶۲-۶۳ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے آیا ہے:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

"اور تم دیکھو گے ان میں سے ایک کثیر تعداد کو کہ تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں گناہ کے کاموں میں اور ظلم و زیادتی میں اور حرام خوری میں۔ بہت بُرے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے درویش

ل لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَيَكُوْنَنَّ فِىْ اُمَّتِىْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ۔ (رواہ الترمذی: عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما)

اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے؟ بہت ہی بُرے عمل ہیں جو وہ کر رہے ہیں"

یعنی اگرچہ کہنے کو یہ لوگ اللہ کے نام لیوا ہیں، موسیٰؑ کے امتی ہیں، تورات کے ماننے والے ہیں، سینکڑوں نبیوں پر ایمان کے دعویدار ہیں، ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں ـــــ لیکن عملاً ان کا حال یہ ہے کہ بجائے نیکیوں میں پیشقدمی کرنے کے تین بُرے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (۱) الْإِثْمَ: گناہ کا کام، فرائض میں کوتاہی کا ارتکاب، حق تلفی اور لوگوں کے حقوق کو غصب کرنے اور سلب کرنے کا کام ـــــ (۲) وَالْعُدْوَانِ: اور ظلم و زیادتی، تعدی (۳) وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ: اور ان کی حرام خوری۔ اس حرام خوری کے مختلف انداز تھے۔ سُود بھی تھا، جُوا بھی تھا۔ اور یہی دوڑ آپ کو اپنے ہاں بھی نظر آجاتے گی۔ آپ کے اس ملک میں جتنے بڑے پیمانے پر جُوا گزشتہ دنوں ہوا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سیور رفیل کی شکل میں کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا جوا کھیلا گیا۔ اور آپ کی وزیر اعظم نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں تو وزیر خزانہ سے کہنے والی ہوں کہ باقی ٹیکس وغیرہ سب کو چھوڑیں اور یہ لاٹری کا دھندا شروع کریں۔ اس میں جو رقم اکھٹی ہوتی ہے وہ ہم نے کسی اور کام میں نہیں دیکھی۔ انعامات کی امید پر جو لاکھوں افراد جُوئے کے مرتکب ہوتے ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ یہ آسمان سے اُترنے والی کوئی دوسری مخلوق نہیں تھی۔ یہ کوئی ہندو نہیں تھے، یہودی نہیں تھے، بلکہ محمدؐ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام لیوا تھے۔

آگے فرمایا: لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ "کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے صوفیاء اور ان کے علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے"۔ ربّانی کہتے ہیں اللہ والے کو، 'ربّ' سے ربّانی بنا ہے یعنی درویش، فقراء، صوفیاء اور صلحاء وغیرہ۔ 'احبار' جمع ہے 'حبر' کی حبر کہتے ہیں بہت بڑے عالم کو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو 'حبر الاُمّہ' کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی دُعا فرمائی تھی کہ اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ یعنی اے اللہ اسے دین کا تفقّہ عطا فرما اور قرآن حکیم کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرما۔ حضورؐ کی دعا کی برکت سے وہ امت کے سب سے بڑے عالم ہو گئے تو ظاہر

بات ہے کہ جس طرح ہماری امت میں بڑے بڑے عالم اور صوفیاء ہیں، ایسے ہی بنی اسرائیل میں بڑے بڑے عالم اور فقیہہ بھی ہوتے تھے اور صوفیاء اور درویش بھی۔ تو فرمایا کہ ان کے کرنے کا کام تو یہ تھا کہ وہ لوگوں کو گناہ کی بات کہنے اور حرام خوری سے روکتے، لیکن فی الحقیقت وہ کیا کام کر رہے ہیں ؟ انہوں نے اپنے فرضِ منصبی کو ترک کر دیا ہے۔ وہ لوگوں کو برائی سے روکتے نہیں ——— اور روکیں بھی کیسے ؟ حرام خوری سے روکیں گے تو لوگ ان کی طرف رجوع نہیں کریں گے کسی دوسرے کی طرف کر لیں گے۔ میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ بتاتا ہوں کہ ایک صاحب نے خود مجھ سے کہا کہ میں آئندہ آپ کے ہاں جمعہ پڑھنے نہیں آؤں گا۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ کہنے لگے کہ آپ ہمیں ہر چند جمعوں کے بعد وہ سود کی شناعت والی حدیث سنا دیتے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ سود کے بغیر تو ہمارا کاروبار چلتا نہیں۔ اب ایسی حدیثیں سننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم لوگ وہ کام کر رہے ہیں جسے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے ساتھ بدکاری سے بھی ستر گنا بڑا گناہ بتایا[1] ہے۔ آپ ہمیں ایسی حدیثیں سناتے رہتے ہیں، چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ آپ کے ہاں نہیں آؤں گا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میرا کام تو سنانا ہے، پہنچانا ہے، سمجھانا ہے۔ سننا چاہو تو سنو! آج نہیں تو شاید اللہ تعالٰی کل توفیق عطا فرما دیں لیکن اگر سننا نہیں چاہتے تو میں زبردستی تو نہیں کر سکتا۔ اب وہ علماء جن کی مجبوری یہ ہے کہ اُن کا معاش کا معاملہ وہیں سے ہے، جن کی تنخواہیں انہی سود خور سرمایہ داروں کی طرف سے آ رہی ہیں وہ انہیں کیسے کہیں کہ حرام خوری ترک کر دو۔ اکثر و بیشتر وہی چوہدری اور سرمایہ دار مساجد کے منتظم اور مہتمم ہیں۔ وہی تو ہیں جو یہاں بہترین قالین لا کر بچھاتے ہیں۔ اب اُن کے کاروبار میں حرام ہے تو انہیں کون روکے! الا ماشاء اللہ۔ اس معاشرے میں کچھ سعید روحیں بھی ہیں جن کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قلیل تعداد امین اور دیانتدار تاجروں اور کاروباری حضرات کی بھی یقیناً موجود ہے اور معدودے چند علماء بھی ایسے ہیں جو کسی ملامت کے خوف کے بغیر نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں لیکن

---

[1] الرِّبٰو سَبْعُوْنَ جُزْءً اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ

(رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان: عن ابی ہریرہ)

معاشرے میں ایسے لوگوں کا وجود آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ جب معاشرے سے نہی عن المنکر ختم ہو جاتا ہے تو پھر تباہی و بربادی عام ہو جاتی ہے۔ آج اس مضمون کو اچھی طرح سمجھیے قرآن کہتا ہے کہ "کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے صوفیاء اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے؟" لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ : "بہت بُرا ہے وہ عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے"۔

سورۃ المائدہ میں آگے چل کر اسی کے ہم مضمون چار آیات مزید آئی ہیں :

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور (حدودِ الٰہی سے) تجاوز کرتے تھے۔ (اور ان کا اصل جرم یہ تھا کہ) وہ ایک دوسرے کو شدّت کے ساتھ منع نہیں کرتے تھے ان برائیوں سے جو وہ کرتے تھے۔ بہت ہی بُرا طرزِ عمل ہے جس پر وہ کاربند تھے۔ تم دیکھو گے ان میں سے بہت سوں کو کہ دوستی رکھتے ہیں کافروں سے۔ کیا ہی بُرا سامان انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے کہ اللہ کا غضب ہوا ان پر اور عذاب میں وہ ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں۔ اور اگر وہ (واقعۃً) ایمان رکھتے ہوتے اللہ پر اور نبیؐ پر اور اس شے پر جو اُس پر نازل کی گئی تو وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بناتے لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر نافرمان ہیں"۔

یہاں اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو اگرچہ بنی اسرائیل میں سے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے امتی تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لاڈلے اور چہیتے ہونے کا دعویٰ بھی تھا، لیکن اُن کی روش گناہ و معصیت اور حرام خوری کی تھی۔ چنانچہ ان پر انبیاء کی زبان سے لعنت فرمائی گئی۔ حضرت داؤدؑ کی زبانی ان پر کیا کیا لعنتیں ہوئیں، ان کے الفاظ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ اس وقت جو بھی 'زبور' موجود ہے جسے 'PSALMS' کہا جاتا ہے اور جو عہد نامہ قدیم (OLD TESTAMENT) کا حصہ ہے اس میں ایسی باتیں موجود نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر حضرت داؤدؑ کی زبان سے جو تنقید کی باتیں کہلوائی تھیں، انہیں یہود نے زبور کے صفحات سے کھرچ دیا ہے۔ لیکن اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ایسی باتیں اناجیل میں اب بھی موجود ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے خاص طور پر علمائے یہود پر بہت تنقیدیں کی ہیں۔ انہیں سانپ کے سنپولیوں سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا: "تم سانپ کے سنپولیوں کے مانند ہو۔ تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے اپنے اُوپر تقویٰ کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے اور اندر سے تمہارا کردار انتہائی گھناؤنا ہے۔" علمائے یہود کو مخاطب کر کے حضرت مسیحؑ نے یہ الفاظ بھی فرمائے: "تمہارا حال اُن قبروں کے مشابہ ہے جنہیں اُوپر سے تو سفیدی کی گئی ہے اور بڑی خوشنما نظر آ رہی ہیں لیکن اُن کے اندر گلی سڑی ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔" اور یہ بہترین ضرب المثل بھی حضرت مسیحؑ ہی کی ہے جو ہمارے ہاں عام طور پر ادب میں استعمال ہوتی ہے کہ "تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو۔" ہمارا حال بھی یہی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو رہے ہیں لیکن بڑے بڑے گناہوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں۔ سُود خوری پر کوئی نہیں روکے گا لیکن رفع یدین، آمین بالجہر اور تراویح کی تعداد پر بڑے بڑے پوسٹر بھی چھپیں گے، بڑے چیلنج بھی ہوں گے، لمبی چوڑی بحثیں اور مناظرے بھی ہوں گے اور پوری پوری کانفرنسیں بھی ہوں گی۔ حالانکہ دین میں ان کی اہمیت بالکل جزوی اور ثانوی ہے۔ دوسری طرف سُود کا لین دین ہو رہا ہے، جوا اور سٹہ سب کچھ چل رہا ہے، لیکن کسی کو کچھ کہنے کی توفیق نہیں۔ اصل میں یہی وہ بات ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل پر لعنت کی گئی۔ آگے فرمایا:

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ "یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کی روش اختیار کی۔" معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر رحمت فرماتا ہے

تو وہ بھی اس کے اعمال کی مناسبت سے، اور اگر اللہ کی طرف سے لعنت ہوتی ہے تو وہ بھی یونہی نہیں ہو جاتی، بلکہ لوگوں کی اپنی بدکاری اور بداعمالی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اب آگے وہ اصل مضمون آ رہا ہے جس کے لیے میں یہ آیات بیان کر رہا ہوں، كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ۔ ان کا سب سے بڑا جرم، سب سے بڑی نافرمانی، اور سب سے بڑا اعتداء یہ ہے کہ جو غلط کام وہ کرتے تھے، اس پر ایک دوسرے کو شدّت کے ساتھ منع نہیں کرتے تھے، روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔ 'تناہی' باب تفاعل سے ہے۔ اسی باب سے لفظ 'تواصی' ہے: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ شدّت اور اشتراک باب تفاعل کا خاصّہ ہے یعنی باہم کسی کام کو انتہائی شدّومد کے ساتھ سرانجام دینا۔ تو 'تناہی' کے معنی ہوں گے پوری تاکید اور شدّت کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے کو گناہوں سے روکنا ٹوکنا۔ قرآن یہود پر فردِ جرم عائد کر رہا ہے کہ ان کا اصل جرم جس کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی وہ یہی تھا کہ وہ منکرات سے ایک دوسرے کو پوری تاکید کے ساتھ روکتے نہیں تھے۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرے کے مختلف طبقات کے اندر مختلف خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے کی برائیوں پر روک ٹوک اس لیے بند کر دیتے ہیں کہ اس طرح خود ان کی اپنی برائیوں پر بھی تنقید ہو گی۔ لہٰذا ان کے مابین گویا ایک شریفانہ معاہدہ (A GENTLEMAN AGREEMENT) ہو جاتا ہے کہ کوئی کسی کو کچھ نہ کہے۔ آج کل کے دور میں تو بسا اوقات اس کو رواداری کا نام بھی دے دیا جاتا ہے کہ ہر ایک کا اپنا اپنا خیال، اپنا اپنا نظریہ، اپنے اپنے معیارات اور اپنی اپنی اقدار ہیں، لہٰذا کسی کو دوسرے پر تنقید کا حق نہیں۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس مضمون سے متعلق ہم ایک حدیث کا مطالعہ بھی کر لیں تاکہ قرآن مجید کی تفسیر حدیثِ رسولؐ کی روشنی میں سامنے آ جائے۔ حدیث چونکہ طویل ہے لہٰذا اس کا ترجمہ و تفہیم ہم متن کے ساتھ ساتھ کریں گے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ مَا دَخَلَ النَّقْصُ عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔

بنی اسرائیل میں سب سے پہلے جو نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا ——

دیکھیے کسی قوم میں جب زوال آتا ہے تو درجہ بدرجہ آتا ہے۔ کوئی آدمی زینے پر چڑھتا ہے تو ایک ایک سیڑھی کر کے چڑھتا ہے اور نیچے اُترتا ہے تب بھی درجہ بدرجہ اُترتا ہے۔ اسی طرح گراوٹ بھی ایک دم سے نہیں آتی۔ بڑے بڑے بند جب ٹوٹتے ہیں تو شروع میں چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بڑی بڑی نہروں میں شگاف ایسے پڑتے ہیں کہ بسا اوقات کسی چوہے کے بل کے ذریعے سے پانی آتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے ایک بڑا شگاف پڑ جاتا ہے۔ تو وہ چوہے کا بل کون سا ہے جو قوموں کو برباد کرتا ہے؟ اس کا ذکر فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا:

اَنَّہٗ کَانَ الرَّجُلُ یَلْقَی الرَّجُلَ فَیَقُوْلُ

کہ ان میں سے ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کرتا تھا تو یہ کہتا تھا ——

یَا ھٰذَا اتَّقِ اللہَ وَدَعْ مَا تَصْنَعُ فَاِنَّہٗ لَا یَحِلُّ لَکَ

اے فلاں، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور جو تم کر رہے ہو اس کو چھوڑ دو، اس لیے کہ یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔

کہ بھائی یہ کاروبار جو تم کر رہے ہو یہ سُود پر مبنی ہے، اسے چھوڑ دو۔ یہ تمہارا طرزِ معاشرت اللہ کے احکام کے مطابق نہیں ہے، اسے تبدیل کرو۔ مثلاً آج ہم کسی سے یہ کہیں گے کہ سیور رلفل کی طرح کی سکیموں میں روپیہ مت لگاؤ، یہ جوا ہے، جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ یہ جو بے پردگی اختیار کی ہے اس کو چھوڑ دو، یہ چیزیں جائز نہیں ہیں، حلال نہیں ہیں —— یہاں تک تو بات اس نے صحیح کی، بُرائی کے اُوپر روک ٹوک کی، نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا —— لیکن

ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ وَهُوَ عَلٰى حَالِهٖ

پھر اس کی اسی شخص سے اگلے روز دوبارہ ملاقات ہوتی تھی اور وہ اپنے سابق حال پر قائم ہوتا تھا ——

یعنی جس بُرائی میں وہ مبتلا تھا، اس کو اس نے ترک نہیں کیا اور اسی طرح اپنی سابقہ حالت پر قائم رہا۔ وہ حرام خوری سے باز نہیں آیا، اپنا سودی کاروبار بند نہیں کیا، جوا کھیلنے سے توبہ نہیں کی، بلکہ حرام کاموں میں اسی طرح ملوّث رہا۔

فَلَا يَمْنَعُهُ ذٰلِكَ اَنْ يَكُوْنَ اَكِيْلَهٗ وَشَرِيْبَهٗ وَقَعِيْدَهٗ

لیکن یہ چیز مانع نہیں ہوتی تھی اُس (پہلے شخص) کے راستے میں کہ وہ اس کا ہم نوالہ وہم پیالہ اور ہم نشین بنے۔

یعنی اس کے باز نہ آنے کے باوجود وہ ناصح (اسے بدی سے روکنے والا) اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا بھی تھا، پیتا بھی تھا، اس کا ہم نشین بنتا تھا، اس کے ساتھ خوش گپیاں کرتا تھا۔ اس کا مقاطعہ اور بائیکاٹ نہیں کرتا تھا۔ دیکھئے، نمازِ وتر میں آپ روزانہ دُعائے قنوت میں یہ الفاظ کہتے ہیں: وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ۔ اے اللہ جو شخص بھی تیرا فاجر ہوگا، تیرے احکام کو توڑنے والا ہوگا، ہم اس سے لاتعلقی کر لیں گے، اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیں گے۔ لیکن عملاً ہمارا حال کیا ہے، اس پر خود غور کر لیجئے! کیا آج ہمارا طرزِ عمل بھی وہی نہیں ہے جو بنی اسرائیل کے مصلحین کا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن جیسے انجام سے محفوظ رکھے۔

فَلَمَّا فَعَلُوْا ذٰلِكَ ضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ۔

جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو آپس میں مشابہ کر دیا۔

کہ جب یہ روش عام ہوگئی اور غیرت و حمیّتِ دینی ختم ہوتی گئی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی باہم ایک جیسا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جب تک کہ ایسے لوگوں کا مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ نہ ہو ان کے رنگ سے آپ بھی نہیں بچ سکیں گے۔ ان کا وہ رنگ آپ پر چڑھ جائے گا اور آپ کے دِل کے اُوپر بھی وہی اثرات طاری ہو جائیں گے۔

اس کے بعد حضورؐ نے سورۃ المائدہ کی یہی چار آیات تلاوت فرمائیں جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں یعنی:

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا . . . . فاسقون ○

یہ گویا کہ ان چار آیات کی مستند شرح ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے سامنے بیان فرمائی کہ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں پہلے پہل جو نقص واقع ہوا وہ یہ تھا کہ لوگوں میں احساس تھا، ان کے علما منکرات سے روکتے تھے کہ خدا کے لیے بُرائی سے باز آجاؤ، لیکن ان کے باز نہ آنے پر ان سے قطع تعلق نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ بنے رہتے تھے اور ان کے ساتھ مجلسی روابط قائم رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تو بدلے نہیں، خود یہ ناصحین اور مصلحین بدل گئے۔ ان کے اپنے دِلوں کی کیفیت تبدیل ہو گئی اور ان کے اُوپر بھی وہی فاسقانہ رنگ چڑھ گیا۔[1]

ثم قال:

(ان آیات کی تلاوت کے بعد) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کَلَّا وَاللّٰهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

ہرگز نہیں، خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا۔

وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا۔

وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰی یَدِ الظَّالِمِ

اور تمہیں لازماً ظالم کے ہاتھ کو قوت کے ساتھ پکڑ لینا ہوگا۔

وَلَتَأْطِرُنَّهٗ عَلَی الْحَقِّ اَطْرًا

اور تمہیں اس کو لازماً حق کی طرف جبراً موڑنا ہوگا۔

---

[1] بقول علامہ اقبال ؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی — خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا

اور اسے حق کے اُوپر قائم رکھنا ہوگا۔

اللہ اللہ ـــــــ، کلامِ نبوت کی فصاحت و بلاغت ملاحظہ فرمائیے اور پھر یہ انتہائی تاکیدی انداز بھی ہے۔ آگے فرمایا:

أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللهُ بِقُلُوبِ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ

یا پھر اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مشابہ کر دے گا۔

یعنی اگر تم بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرو گے اور اس ضمن میں اپنی ذمّہ داری ادا نہیں کرو گے تو اللہ تمہارے دلوں کو بھی آپس میں ایک جیسے کر دے گا۔ انہی لوگوں جیسی قلبی کیفیات، وہی بے حسی، وہی بے غیرتی تمہارے اندر بھی پیدا ہو جائے گی۔

ثُمَّ لَيَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ

پھر اللہ تعالٰے تم پر بھی لعنت فرمائے گا جیسے ان (یہود) پر لعنت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس آخری انجام سے بچائے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ

اس حدیث کو امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ دونوں نے روایت کیا ہے۔ اور (امام ترمذیؒ نے) فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

هٰذَا لَفْظُ أَبِي دَاوُدَ، وَلَفْظُ التِّرْمِذِيِّ:

متذکرہ بالا الفاظ روایتِ ابو داؤدؒ کے ہیں اور ترمذیؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں (جو آگے آرہے ہیں):

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ فِي الْمَعَاصِي

جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے

نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ

تو اُن کے علماء نے انہیں روکا۔ (یعنی ابتدا میں اُن کے علماء نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے)۔

فَلَمْ يَنْتَهُوا

لیکن وہ باز نہ آئے۔

فَجَالَسُوهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَوَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ

(لیکن اس کے باوجود ان علماء نے) ان کی ہم نشینی اور ان کے ساتھ باہم کھانا پینا جاری رکھا۔

فَضَرَبَ اللهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ

تو (اس کے نتیجہ میں) اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا۔

وَلَعَنَهُمْ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ

اور ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ

یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے رہے۔

فَجَلَسَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَّكِئًا وَقَالَ:

اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر بیٹھ گئے، جبکہ اس سے پہلے آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اور فرمایا:

لَا، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ

ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔

حَتّٰى تَأْطِرُوهُمْ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا

(تمہاری ذمّہ داری اس وقت تک ادا نہیں ہو گی) جب تک کہ تم انہیں زبردستی حق کی طرف موڑ نہ دو!

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی رُو سے ہمارے علماء و صلحاء کا اور ان صوفیاء کا جو لوگوں کو تزکیۂ نفس کے طریقے اور تقرّب الی اللہ کے راستے بتا رہے ہیں، سب سے بڑا فرض یہی نہی عن المنکر ہے۔ ان سب پر واجب ہے کہ وہ

لوگوں کو منکرات پر ٹوکیں، انہیں منع کریں، ان پر تنقید کریں —— اور اگر باز نہ آئیں تو ان کے ساتھ مقاطعہ کریں، ملنا جلنا چھوڑیں، ان پر یہ سوشل پریشر ڈالیں۔ اِس وقت اگرچہ اہلِ حق علما بھی موجود ہیں، دنیا کبھی ان سے خالی نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی —— اس کی ضمانت دی ہے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لَا یَزَالُ فِی اُمَّتِی طَائِفَۃٌ قَائِمِیْنَ عَلَی الْحَقِّ (میری اُمّت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا) —— لیکن اِس وقت ان کی اکثریت کا حال کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر بیچارے ملازم ہیں۔ انہی لوگوں کی طرف سے آنے والی تنخواہوں پر اُن علماء و خطباء کی معیشت کا دار و مدار ہے۔ انہی کی طرف سے موصول ہونے والے ہدیوں اور نذرانوں سے ان کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ انہیں روکیں اور ٹوکیں تو کس طرح؟ اِلّا ماشاء اللہ!

دینی جماعتیں اور پاور پالیٹکس!

ان سے آگے بڑھ کر میں فعّال دینی جماعتوں کے بارے میں عرض کر رہا ہوں کہ پاور پالیٹکس میں ان کے ملوّث ہونے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی ساری دوستیاں اور تعلّقات اُنہی لوگوں کے ساتھ ہیں جو کُھلم کُھلا منکرات میں مبتلا ہیں۔ یہ اُنہی کے ولیموں میں شریک نظر آئیں گے اور اخبارات میں فوٹو چھپیں گے کہ فلاں حضرت بھی بیٹھے ہوتے ہیں، فلاں جماعت کے لیڈر بھی تشریف فرما ہیں، فلاں کے آدمی بھی آئے ہوتے ہیں —— اور اس طرح کے ولیموں میں جو کچھ منکرات ہوتی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان لوگوں کا جو رویّہ ہے، جو کردار ہے اور ہماری پوری اجتماعی زندگی کے اندر جو زہر وہ گھول رہے ہیں اس سب سے صرفِ نظر کر کے صرف وقتی سیاست کے پیشِ نظر کسی وقت کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کی خاطر ان کے ساتھ اتحاد ہو جائے گا اور کوئی تفریق نہیں ہوگی کہ اس کا نظریہ کیا ہے، اس کا رہن سہن کیسا ہے، اس کا ذریعۂ معاش کیا ہے، اس کے ہاں پردہ ہے یا بے پردگی ہے، کوئی پروا نہیں! حدیث کے الفاظ "وَوَاکَلُوْھُمْ وَشَارَبُوْھُمْ" کے مصداق انہی کی ہم جلیسی، انہی کے ساتھ کھانا پینا، سماجی تقریبات میں ان کے ساتھ شرکت اور سیاسی اتحادوں میں ان کے ساتھ جمع ہو جانا یہ

ساری روش اس مطلوب طرزِ عمل کی بالکل ضد ہے۔ اگر ہم اپنی روش تبدیل نہیں کرینگے تو پھر محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب ہم اللہ کی لعنت کے مستحق ہوں گے۔ جیسا کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ لازماً تم پر بھی لعنت کرے گا جیسے اس نے لعنت فرمائی تھی بنی اسرائیل پر۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امّتی ہو تو بنی اسرائیل کو بھی بڑا فخر تھا کہ ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں، ہم موسیٰؑ کے امتی ہیں، ہم تورات کے ماننے والے ہیں، نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ، کہ ہم تو اللہ کے بیٹوں کے مانند ہیں اس کے بڑے لاڈلے اور چہیتے ہیں ــــــ لیکن ان کا یہ چہیتا اور لاڈلا ہونے کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے عدل کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنا۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ (ان پر مسلط کر دی گئی ذلت اور محتاجی اور وہ پھرے اللہ کا غصہ لے کر)۔

اگلی آیات میں ان کے مجلسی روابط کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

تَرٰى كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ يَتَوَلَّوۡنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ

تم دیکھو گے ان میں سے بہت سوں کو کہ دوستی اختیار کرتے ہیں انہی کی جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی۔

انہی کے ساتھ مجلسی روابط ہیں، انہی سے دوستیاں استوار ہو رہی ہیں اور محبت کی پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ اس دور میں ہماری دینی جماعتوں کے اتحاد اور گٹھ جوڑ اُن لوگوں کے ساتھ ہو رہے ہیں جن کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو برملا کہہ رہے ہیں کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے۔ یہ گویا کہ بہت بڑا اجتماعی جُرم ہے کہ کسی کے عقائد و نظریات، افعال و کردار اور شخصیت و کردار کی تمیز کیے بغیر اس سے روابط بڑھا لیے جائیں۔

لَبِئۡسَ مَا قَدَّمَتۡ لَهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ

بہت بُری ہے وہ کمائی جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجی ہے۔

یعنی ان کے اس طرزِ عمل کے نتیجے میں اللہ کے ہاں ان کے لیے جو کچھ جمع ہو رہا ہے بہت بُرا ہے۔ اور وہ کیا ہے؟

أَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ○

وہ یہ کہ اللہ کا غضب ہوا ان پر اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

بنی اسرائیل اپنے کرتوتوں کی بناء پر اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ ان کے لیے قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر "وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ" کے الفاظ آتے ہیں اور یہاں انہیں 'خلود فی العذاب' کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے عذاب تو خالص کفّار کے لیے ہو گا اور جو کوئی تھوڑا سا ایمان بھی رکھتا ہو اس کے لیے دائمی عذاب نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ سزا علمائے یہود کے لیے فرمائی جا رہی ہے گویا ان کے طرزِ عمل سے درحقیقت ان کے ایمان کی نفی ہو رہی ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ

اور اگر وہ (واقعتاً) ایمان رکھتے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور اس شے پر جو اس پر نازل کی گئی۔

مَا اتَّخَذُوْهُمْ أَوْلِيَاءَ

وہ انہیں اپنا دوست نہ بناتے۔

جو سمجھتے ہیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں، اگر وہ واقعتاً ایمان رکھتے ہوتے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستیاں گانٹھتے اور ان سے مجلسی روابط استوار کرتے۔ ایمان کے اندر تو غیرت ہوتی ہے جو کسی درجے میں بھی ایسی بات برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان کی اکثریت فسّاق و فجّار پر مشتمل ہے۔

سورۃ المائدہ کے یہ دو مقامات اور ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کی روایت کردہ یہ دو احادیث جو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں، ان میں بلاشبہ ہمارے لیے ہدایت و رہنمائی کے خزانے مضمر ہیں۔ آپ انہیں خود بھی پڑھیے اور انہیں دوسروں تک بھی پہنچائیے، انہیں عام کیجیے! اور اللہ کرے کہ یہ آیات اور احادیث ان حضرات کے کانوں تک بھی پہنچ جائیں جو دین و مذہب کے نام لیوا ہیں اور وہ ان کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں کچھ غور کریں۔ ان دینی جماعتوں کی حالت دیکھ کر بالخصوص شدید صدمہ ہوتا ہے جو فی الوقت پاور پالیٹکس میں

دائیں یا بائیں بازو کی بڑی سیاسی جماعتوں کے ضمیمے بنی ہوئی ہیں، جبکہ انہیں معلوم بھی ہے کہ فریقین میں انیس بیس سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ وہی سرمایہ دار، جاگیردار اور زمیندار اِدھر بھی ہیں اور اُدھر بھی ـــــــ اور ان کے لچھن، ان کے طرزِ معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کی اقدار میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر مینڈکوں کی طرح پھدکتے رہتے ہیں، یا آجکل کی اصطلاح میں ہارس ٹریڈنگ ہو رہی ہے۔ لیکن مذہبی جماعتیں اِدھر یا اُدھر نتھی ہو کر اور اپنی طاقت ان کے پلڑوں میں ڈال کر خود اپنی منزل کھوٹی کرتی ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام تو، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، فریضہ نہی عن المنکر کی ادائیگی ہے۔

ایک اچھی مثال

اس سلسلے میں گزشتہ دنوں کچھ اچھی خبریں آئی تھیں اور بعض حلقوں کی طرف سے نہی عن المنکر کے ضمن میں زوردار موقف اختیار کیا گیا۔ (کثّر اللّٰہ امثالھم ۔ اللہ کرے کہ ان کی مثالیں اور بڑھیں!) اور مجھے اس پر خوشی ہے کہ کم از کم جماعت اسلامی نے تو اس سلسلے میں ڈٹ کر موقف اختیار کیا۔ اس اقدام کی جو برکتیں ظاہر ہو رہی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ بھارتی طائفے کی آمد رک گئی ہے اور سالِ نو کے جشن کے عنوان سے بڑے بڑے ہوٹلوں میں طوفانِ بدتمیزی کے جو مظاہرے ہوا کرتے تھے، وہ اب لوگوں کی اپنی کوٹھیوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور اس موقع پر بعض ایسی تنظیموں کی طرف سے بھی جماعت کا ساتھ دینے کا اعلان آ گیا تھا جن کے نہ صرف افکار و نظریات ان سے مختلف ہیں، بلکہ اُس وقت ان کے مابین شدید کشیدگی بھی تھی۔ چنانچہ اس سے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا کہ یہی راستہ دینی جماعتوں کو مجتمع کرنے کا راستہ ہے!!

بعض حضرات تبلیغی جماعت سے بڑی مایوسی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ لوگ تو سیاست کی بات بھی کرنے کو تیار نہیں، اور مسلمانوں پر اگر کہیں کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس پر بھی کوئی آواز اٹھانے کے روادار نہیں۔ یہ بات اگرچہ بنیادی طور پر غلط نہیں ہے، انہوں نے بطور پالیسی یہ روش اختیار کی ہے اور وہ نہی عن المنکر سے صرفِ نظر کر کے صرف امر بالمعروف کا کام کیے جا رہے ہیں ـــــــ

اور میں ابھی قرآن حکیم کے نو مقامات کے حوالے سے ان کی اس غلطی کو واضح بھی کر چکا ہوں — لیکن جو کام یہ کر رہے ہیں وہ بھی رائیگاں جانے والا نہیں ہے۔ یہ خیر و شر اور حلال و حرام کا شعور تو پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین حاصل ہے کہ اِس معاشرے میں اگر کوئی ایسی قوت پیدا ہو جائے جو نہی عن المنکر کو طاقت کے ساتھ کرنے کے لیے میدان میں آئے، تو تبلیغی جماعت کے ساتھ عوام کی جو طاقت ہے' ان کی بہت بڑی تعداد اس کام میں شریک ہو جائے گی۔ تحریکِ نظامِ مصطفےٰؐ میں بھی تو تبلیغی جماعت سے وابستہ بہت سے نوجوان میدان میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اور میں آپ کو اسی تحریک کا وہ واقعہ یاد دلاتا ہوں جب لاہور کے نیلا گنبد چوک میں تبلیغی جماعت کا ایک نوجوان بار بار کی وارننگ کے باوجود سینہ تانے آگے بڑھتا رہا اور بالآخر سینے میں گولی کھا کر جامِ شہادت نوش کر گیا۔ ان واقعات میں انسان کے لیے عبرت کا وافر سامان پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس ملک میں ۱۹۸۲ء میں میرے حوالے سے بعض مغرب زدہ خواتین نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا' مجھے اُسی وقت اس حقیقت کا تجربہ ہو گیا تھا کہ اگر واقعتہً کوئی جماعت نہی عن المنکر کا کام کرنے کے لیے کھڑی ہو جاتی تو تمام مذہبی مکاتبِ فکر ساتھ دیں گے۔ اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اگرچہ عملی طور پر انحطاط کا شکار ہے لیکن ہماری چودہ سو برس کی تاریخ نے ہمارا جو اجتماعی ذہن بنایا ہے اس کے تحت الشعور میں معروف اور منکر کے صحیح تصوّرات موجود ہیں۔ چنانچہ اُس موقع پر تمام مکاتبِ فکر کی مساجد سے میری تائید ہوئی، جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے میرے حق میں حیدر آباد سندھ میں تقریر کی' اور کراچی میں جماعت اسلامی کے حلقہ خواتین کی طرف سے مغرب زدہ خواتین کے جلوس کے جواب میں باپردہ خواتین کا کئی گنا بڑا جلوس نکالا گیا تو اُس وقت یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی کہ ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی! لیکن اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے ایک جماعت ایسی ہو جو منکرات کے خلاف میدانِ عمل میں آنے والوں کو کنٹرول میں رکھ سکے۔ یہ نہ ہو کہ کہیں ع "دینِ مُلاّ فی سبیل اللہ فساد" کی صورت پیدا ہو جائے! جب تک یہ شکل نہ ہو جائے اس وقت تک میدان میں آنے کے مثبت نتائج نہیں نکل سکتے، بلکہ اس سے جو سیاسی بے چینی پیدا ہو گی اس سے کچھ اور لوگ فائدہ اُٹھا لے جائیں گے، جو ملحد و بے دین بھی ہو سکتے ہیں اور ملک و قوم کے دشمن بھی!!

دو مزید احادیث

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت کے ضمن میں مزید دو احادیث کا مطالعہ کر لیجیے۔ میرے خطابات میں ان احادیث کا ذکر بار بار آیا ہے۔ "مسلمانوں کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل" میں بھی ان کا تذکرہ ہے، لیکن وہاں متن موجود نہیں ہے۔ یہاں ہم متن کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ:

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا

جو کوئی بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے

فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ

تو وہ اپنے ہاتھ سے اسے بدلے!

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ

اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس برائی کو روکے!)

اس کو ذرا اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ نہی عن المنکر کے جن دو درجوں کا بیان یہاں ہوا ہے اُن میں سے پہلا درجہ ہے "نہی عن المنکر بالید" کا ——— یعنی کوئی برائی نظر آئے تو "زورِ دست و ضربتِ کاری" سے اس کا قلع قمع کر دیا جائے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس برائی سے نمٹنے کے لیے مؤثر قوت موجود ہو۔ بصورتِ دیگر بندۂ مومن کا فرض ہے کہ وہ اس قوت کے حصول کے لیے کوشاں ہو ——— اور اس کے ساتھ ہی "نہی عن المنکر باللسان" کا فریضہ ادا کرے یعنی زبان سے لوگوں کو روکا جائے کہ خدا کے لیے اس سے باز آجاؤ، اسے چھوڑ دو۔ زبانی مدافعت میں قلم بھی داخل ہے۔ اس مقصد کے لیے کتابیں اور رسالے شائع کیے جائیں۔ نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع بھی بروئے کار لائے جائیں۔ آج نہی

عن المنکر باللسان کا ایک بہت بڑا ذریعہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹس ہیں۔ آپ گفتگو اور تقاریر کو اس ذریعے سے عام کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی مقرر کی کوئی تقریر دُور دُور تک پہنچ سکتی ہے۔ آج میں یہاں جو تقریر کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کل ہمارے کوئی دوست اس کا کیسٹ لے کر امریکہ یا آسٹریلیا پہنچ جائیں۔ ہمیں پتہ بھی نہیں ہوگا اور یہ کیسٹ وہاں پھیل رہا ہوگا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت میرے دروس و خطابات کے کیسٹ لاکھوں کی تعداد میں پوری دنیا میں گردش میں ہیں۔ میں نے حال ہی میں 'حکمتِ قرآن' کا جنوری فروری ۹۰ء کا جو مشترکہ شمارہ شائع کیا ہے، اس میں دعوت رجوع الی القرآن کی ایک پوری تاریخ بیان کر دی ہے[۱]۔ میں اس کے بارے میں بھی خاص طور پر عرض کروں گا کہ جس شخص کو بھی ہمارے اس کام سے کوئی عملی دلچسپی ہے وہ اس شمارے کو ضرور پڑھے اور اس کے مندرجات پر سنجیدگی سے غور کرے! اس میں پوری تاریخ بیان کی گئی ہے کہ امت کا تعلق قرآن سے کیوں کمزور پڑا۔ پھر یہ کہ قرآن کی طرف رجوع کا دوبارہ آغاز کب ہوا۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کیا مقام ہے اس کے بعد اب تفسیر قرآن کے جو سلسلے چل رہے ہیں وہ کون کون سے ہیں ——— اور اس راستے میں انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کی خدمات کیا ہیں۔ یہ ساری داستان آپ کو اس ایک پرچے میں مل جائے گی۔ اور اس وقت میرا ذہن اس کی طرف اس لیے منتقل ہوا کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی عمر اور اپنی صلاحیتیں اس کام میں لگائی ہیں۔ مجھے یہ کام کرتے ہوئے پورے پچیس برس ہو گئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں میں اس شہر کراچی سے منتقل ہو کر اپنے اس کام کو شروع کرنے کے لیے لاہور گیا تھا۔ اب ۱۹۹۰ء آ گیا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری عمر کی ربع صدی بیت چکی ہے کہ قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا ہی میرا اصل مشغلہ رہا ہے۔ ان میں سے چھ سال (۶۵ء تا ۷۱ء) ایسے ہیں کہ ساتھ مطب بھی چل رہا تھا۔ فروری ۷۱ء میں میں نے حرم شریف میں بیٹھ کر یہ طے کیا کہ اب ہمہ وقت یہی کام کروں گا۔ چنانچہ میں نے مطب بند کیا،

---

[۱] 'حکمت قرآن' کے مذکورہ شمارے کے مندرجات محترم ڈاکٹر صاحب کی تازہ تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ (مرتب)

پریکٹس چھوڑی اور اُس وقت کے بعد سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا کوئی لمحہ بھی فکرِ معاش میں بسر نہیں ہوا۔ مَیں نے اپنی ساری توانائیاں اور قوتیں اسی کام میں لگائی ہیں۔ اور آج مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے یہ دروسِ قرآن دنیا کے کونے کونے میں سُنے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے فضل و کرم سے میرے اپنے تین بچوں سمیت پچیس تیس اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اب اسی انداز میں درس دے رہے ہیں۔ میرا یہ کام الحمدللہ جاری رہے گا اور یہ بات بڑھتی رہے گی، پھیلتی رہے گی، لوگوں تک پہنچتی رہے گی۔ اور ہمیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ کہاں کہاں تک یہ باتیں پہنچ رہی ہیں۔

میں نے اس پرچے میں لکھا ہے کہ میں اکتوبر ۸۹ء کے اواخر میں جب حیدر آباد دکن گیا، وہاں ایک روز میری تقریر ہوئی، جس کے کیسٹ رات بھر تیار کیے گئے۔ اگلے روز جب میری تقریر ہوئی تو سات سو کیسٹ تیار ہو سکے تھے، جو سب کے سب فروخت ہو گئے۔ اور یہ کیسٹ وہ شے ہے جو تین منٹ میں کاپی ہو جاتا ہے۔ نہ معلوم اس سے آگے کتنی جگہ پر بات پہنچ رہی ہو گی۔ اور گزشتہ رات ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ وہاں میں نے سیرت النبیؐ کے جلسے میں جو تقریر کی تھی، جس میں ڈیڑھ پونے دو لاکھ سامعین تھے، قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس تقریر میں سے پندرہ منٹ کی تقریر دُور درشن (ٹیلی ویژن) کے نیٹ ورک پر پُورے انڈیا میں دکھائی گئی۔ تو یہ بات تو ان شاء اللہ پھیلتی رہے گی۔ میں اگرچہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں اور اکثر علیل رہتا ہوں، لیکن بہرحال جب تک جان میں جان ہے اور جب تک بھی یہ اعضاء و جوارح ساتھ دے رہے ہیں یہی کام کرنا ہے، اللہ کے اس پیغام کو پہنچانا ہے۔ نہی عن المنکر باللسان کا یہ کام کرتے رہنا ہے۔ ہم غلط کو غلط کہیں گے، حرام کو حرام کہیں گے، خواہ کسی کو کتنا ہی ناگوار گزرے! کسی کو نہیں سُننا ہے، نہ سُنے! جمعہ چھوڑ کر جاتا ہے، چلا جائے! الحمدللہ اس معاملے میں مجھے تعداد کی کوئی فکر نہیں ہوتی، لیکن بات وہی کہنی ہے جو صحیح ہو۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ آج تک یہ سوال کبھی میرے سامنے نہیں آیا کہ میری بات سے کون راضی ہے، کون ناراض!! البتہ میں نے ہر بات کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچا ہے کہ آیا میرا اللہ اس پر راضی ہو گا یا ناراض۔ یا یہ سوچا ہے کہ میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ اس کے سوا تیسری بات کبھی سامنے نہیں آئی۔

جہاں تک "نہی عن المنکر بالید" کا تعلق ہے تو اس بارے میں جو بات میں نے ہمیشہ کہی ہے وہی اب کہہ رہا ہوں کہ اس کے لیے ایک منظّم جمعیّت درکار ہے۔ جب ایسے COMMITTED اور DEDICATED لوگوں کی ایک معتدبہ تعداد جمع ہو جاتے جو اس سہ نکاتی لائحہ عمل پر عمل کر چکے ہوں، جو پہلے خود اپنی زندگی کے اندر حلال وحرام کی پابندی کر رہے ہوں، خود دین پر کاربند ہوں، پھر وہ سمع وطاعت کا نظم اختیار کر کے ایک مضبوط جمعیت فراہم کریں اور ایک بنیانِ مرصوص بن جائیں، تب چیلنج کا مرحلہ آئے گا اور طاقت کے بل پر یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ہم یہ منکرات نہیں ہونے دیں گے۔ ہم حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ پہلے ہماری جان جائے گی، اُس کے بعد اللہ کی کوئی حد پامال ہو سکے گی۔ ہمارے جیتے جی یہ غیر شرعی کام نہیں ہو سکے گا! ہمارا ماٹو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے وہی الفاظ ہوں گے: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ! "کیا دین میں تبدیلی کر دی جائے گی جبکہ میں زندہ ہوں!" اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقام تک پہنچائے۔ لیکن اس کے لیے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں طاقت فراہم کرنا ہو گی جس طرح محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے فراہم کی۔ جب طاقت فراہم ہو گئی تب آپؐ نے تلوار سے جہاد کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ محمدٌ رسول اللہ تیرہ برس تک اُسی بیت اللہ کا طواف کرتے رہے اور وہیں نماز پڑھتے رہے جہاں دائیں بائیں ہر طرف بُت رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے اُس وقت کسی بُت کو نہیں توڑا۔ پہلے طاقت فراہم کی، دعوت، تربیت اور تنظیم کے مرحلے طے کیے، اللہ کے ایسے فدائی اور شیدائی جمع کیے جو "اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی . . . الخ" کی عملی تصویر بن گئے۔ پھر آپؐ کا مشرکین سے براہِ راست مسلّح تصادم ہوا، بدر واُحد کے معرکے ہوئے اور جب آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے ایک لحظے کے لیے بھی ان بتوں کا وجود گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ آپ "جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا" کے الفاظ فرما رہے تھے اور ایک ایک بُت کو توڑتے جاتے تھے۔ یہ ہے نبوی طریقِ انقلاب! یہاں میں نے دو جملوں میں بات کر دی ہے، اگر تفصیل پڑھنی ہے تو اس کے لیے "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے عنوان سے کتاب موجود ہے۔

اب آیئے نہی عن المنکر کے تیسرے درجے کی طرف۔ اس حدیث میں آگے یہ الفاظ ہیں:

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ

اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو پھر اپنے دل سے!

یعنی اگر زبانوں پر بھی پہرے بٹھا دیئے گئے ہوں تو برائی کو دیکھ کر دل کے اندر ایک صدمہ اور ایک رنج اور دکھ اور کرب کا احساس تو ہو۔ فرمایا:

وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ

اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

اگر منکرات کو دیکھ کر کسی کی جبیں پر بل بھی نہ پڑے، اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہ ہو اور وہ اندر سے تلملا نہ اُٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے اس کی غیرتِ ایمانی دم توڑ چکی ہے اور وہ ایمان کی پونجی سے یکسر محروم ہو گیا ہے۔ اعاذ نا اللہ من ذلک!

یہ مسلم شریف کی روایت ہے۔ دوسری حدیث بھی مسلم شریف ہی کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، یہ بڑی اہم حدیث ہے اور میں اس کے حوالے سے آج ایک بڑا اہم مسئلہ بیان کروں گا جو اس سے قبل میں نے کبھی وضاحت سے عرض نہیں کیا۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّۃٍ قَبْلِیْ

کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنہیں اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو۔

اِلَّا کَانَ لَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ

مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی امت میں سے کچھ (لوگ نکلتے تھے جو اس کے) حواری اور اصحاب ہوتے تھے۔

حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کے لیے قرآن حکیم میں 'حَوَارِیُّوْن' کا لفظ آیا ہے اور حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے لفظ "صحابہؓ" استعمال ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں دونوں لفظ جمع فرما دیئے۔ اب نوٹ کیجئے کہ انبیاء کے حواری اور اصحاب کرتے کیا تھے:

يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ

وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے

یہ حواری اور اصحاب اپنے نبیؑ کی اقتدا کرتے تھے، پیروی کرتے تھے۔ جیسے نماز میں ایک امام ہوتا ہے اور اس کے پیچھے مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ

پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آجاتے تھے ——

جیسے ہم ہیں، جیسے آج کی امتِ مسلمہ ہے۔ یہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ یہاں بھی حضورؐ نے دو ہی باتیں بیان فرمائیں:

يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ

کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے —— اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔

مثلاً بدعات، نئی نئی رسومات اور نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی جاتی رہی ہیں، جن کا اللہ کی کتاب میں کوئی حکم ہے، نہ اس کے رسولؐ کی سُنّت اور صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری کے زبانی دعوے جو ہیں وہ بہت بلند بانگ ہیں۔ اس طرزِ عمل کے بارے میں سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ "اے مسلمانو، کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟" لیکن کہنے میں کیا جاتا ہے؟ حضورؐ کے عشق کے دعوے کیجئے، عشقِ رسولؐ کے اظہار کے لیے بڑی لمبی چوڑی نعتیں پڑھ لیجئے —— کیا گیا؟ کچھ بھی نہیں! محض زبان ہلا دینا تو بہت آسان ہے —— چنانچہ اُن لوگوں کا طرزِ عمل یہ تھا کہ کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ آگے آپؐ نے فرمایا:

فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

تو جو شخص ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مومن ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے وہ مومن ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنے دل سے وہ بھی مومن ہے۔

وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ

اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!

گویا کہ احساس ہی نہیں رہا منکرات پھیل رہے ہیں، بے حیائی عام ہو رہی ہے، بدعات پھیل رہی ہیں رسُومات کے طومار پر طومار ہیں۔ اور جو کچھ آجکل شادیوں میں ہو رہا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ سب ہو رہا ہے اور ہمارے احساسات کے اوپر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ معلوم ہوا کہ ہم "وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ" کے زمرے میں آرہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ معاف فرمائے اور ہمیں اپنے ایمان کی تجدید کی توفیق عطا فرمائے۔

کیا مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج جائز ہے؟

اب یہاں اس حدیث کی رُو سے جو ایک اہم مسئلہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے عام طور پر سُنی مسلمانوں میں ایک خیال عام ہو گیا ہے کہ اصحاب اقتدار خواہ کتنے ہی فاسق و فاجر اور ظالم و جابر ہوں، اُن کے طور طریقے خواہ کیسے ہی ہوں، اُن کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ آپ کو کفر کا حکم نہ دیں۔ اصل میں بعض احادیث اس مضمون کی ہیں کہ جب تک کفر بواح کا حکم نہ دیا جائے بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اُن احادیث کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا اور عام طور پر اہلِ سنّت میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ شاید خروج کسی شکل میں جائز نہیں! اور میں اسی کا نتیجہ اس وقت کی سُنّی دنیا میں دیکھ رہا ہوں کہ بدترین جبر و استبداد کے باوجود کہیں بیداری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ میرے لیے آجکل یہ مسئلہ بڑے گہرے غور و فکر کا موجب ہو گیا ہے کہ اگرچہ دنیا میں سنّیوں کے مقابلے میں شیعہ تعداد کے اعتبار سے بہت قلیل ہیں، لیکن اس صدی میں اگر کہیں انقلاب برپا کیا تو شیعوں نے کیا ——

ایک بڑی مستحکم بادشاہت کا تختہ اُلٹا اور اپنی فقہ کے مطابق ایک نظام قائم کرلیا۔ جبکہ دوسری طرف موریطانیہ سے لے کر انڈونیشیا تک پوری سُنّی دنیا میں جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور الاخوان المسلمون جیسی عظیم تحریکوں کی موجودگی کے باوجود کہیں بھی انقلاب کے کوئی آثار ابھی دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ آخر اس کا کوئی سبب تو ہے! غور طلب مسئلہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سُنّی مسلمان سُنّ ہوکر کیوں رہ گئے ہیں؟ یہ بڑا حسّاس مسئلہ (SENSITIVE ISSUE) ہے اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا میں نے آج تک اس پر کبھی گفتگو نہیں کی ہے ——— لیکن کچھ دنوں سے میں شدت کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ لازمی طور پر فکر اور نظریے کے اندر کہیں کوئی خامی موجود ہے! مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ معاشی مسئلے پر کھڑے ہو جائیں گے، سیاسی مسئلے پر کھڑے ہو جائیں گے، کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کو جمع ہو جائیں گے، سینکڑوں لوگ جانیں بھی دے دیں گے، لیکن استحصالی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی منظم کوشش کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی منظم کوشش اسی دَور میں ایرانیوں نے کر کے دکھادی ہے۔ جیسا کچھ بھی اُن کا دین ہے، جو بھی اُن کی فقہ ہے اور جو بھی اُن کے تصوّرات ہیں اُن سے ہمیں لاکھ اختلاف سہی، لیکن انہوں نے اسے نافذ تو کر کے دکھا دیا ہے۔ اور ہم نے کیا کیا؟ ہمارے ہاں بادشاہتیں چل رہی ہیں، ان بادشاہوں کے لیے ایک ایک محل کی تعمیر پر اربوں ڈالر صَرف ہوتے ہیں، جہاں بادشاہ سلامت کو سال بھر میں زیادہ سے زیادہ چار چھ دن قیام کرنا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ اُسی ملک کے اندر جاکر دیکھیے کہ انسان بالکل حیوانوں کی طرح رہتے ہوتے بھی نظر آئیں گے۔ تو یہ نظام ہمارے ہاں کیوں نہیں بدل رہا؟

ان دنوں خاص طور سے مجھ پر یہ سوچ جو بہت زیادہ طاری ہے تو اس کی وجہ بھی میں بیان کیے دیتا ہوں۔ گزشتہ دنوں جب جہادِ افغانستان بڑی شدت کے ساتھ جاری تھا اور روسی افواج ابھی افغانستان سے نہیں نکلی تھیں اُس وقت ایک بات متواتر سننے میں آرہی تھی کہ روسی ترکستان کی ریاستوں سمرقند و بخارا وغیرہ میں جہاد افغانستان کے اثرات بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں، ان میں دینی جذبات زندہ ہو رہے ہیں ——— اور ان شاء اللہ روس کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور افغانستان میں اس کی مداخلت کے نتیجے میں ان تمام ریاستوں میں بغاوت

ہو جائے گی۔لیکن میں حیران ہوں کہ بغاوت ہوئی تو سب سے پہلے یورپی علاقوں میں ہوئی۔
روس کی گرفت ذرا کمزور پڑی تو یورپ میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور
چوتھا ملک روسی استبداد کی زنجیریں توڑتا نظر آیا۔ پھر یہ کہ روس کی اپنی ریاستوں مثلاً بالٹک سٹیٹس،
لیتھوانیا وغیرہ کے اندر بغاوت ہوگئی ——— گورباچوف نے جا کر معافیاں مانگی ہیں،
خوشامدیں کی ہیں کہ ہم روسی دستور میں "طلاق کا حق" رکھ دیتے ہیں، خدا کے لیے اس وقت علیحدہ
نہ ہوں، آئندہ کے کسی مرحلے کے لیے ہم باقاعدہ دستوری راستہ کھول دیں گے۔لیکن انہوں
نے اس کی ایک نہیں مانی! اس کے بعد اگر کوئی بغاوت کی خبر سننے کو ملی تو آذربائیجان سے
جہاں شیعہ مسلمان آباد ہیں۔ یہ سنّی ریاستیں ساری سُن پڑی ہوئی ہیں اور ابھی تک ان میں کہیں سے
بیداری کی کوئی لہر نہیں اٹھی اور دورِ حاضر کا اتنا عظیم جہاد، جہادِ افغانستان بھی اُن کے تنِ مُردہ
میں جان نہ ڈال سکا، جس نے ع "جی اُٹھے مُردے تری آواز سے" کے مصداق کشمیریوں
تک کو زندہ کر دیا، جن کے بارے میں "تیسی تے ٹھس کرسی" کا لطیفہ مشہور ہے!

میرے اپنے غور و فکر کی حد تک اس کی وجہ یہی ہے کہ سُنّی اسلام میں کچھ علما نے اس خیال کو عام
کر دیا ہے کہ حاکموں کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی۔ حاکم چاہے کیسا بھی ہو، جب تک وہ آپ
کو کفر کا حکم نہ دے، آپ اس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے محل میں شراب نوشی
کرتا ہو، بدمعاشی کرتا ہو، کرتا رہے۔لیکن بغاوت صرف اُس وقت ہو سکتی ہے جب وہ آپ
کو کفر کا حکم دے۔ اس خیال نے سُنّی تصوّرات کے اندر ایک طرح کا انفعالی (PASSIVE)
انداز پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ جو چیلنج کرنے والا ACTIVE انداز ہے، وہ آج ہمیں پوری
سُنّی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ حالاں کہ حکمرانوں کے طرزِ عمل پر گرفت کرنے کے سلسلے میں
اس صحیح حدیث کے الفاظ کس قدر واضح اور دوٹوک ہیں۔لیکن حدیث کے ضمن میں اکثر و بیشتر
ہوتا یہ ہے کہ ایک حدیث پر توجّہ کو مرتکز کر دیا جاتا ہے اور دوسری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے،
پورے ذخیرۂ احادیث پر متوازن انداز میں نظر نہیں رکھی جاتی۔ غور کیجیے کہ احادیث میں جہاں
وہ حدیث موجود ہے کہ جب تک اربابِ اقتدار کفرِ بواح کا حکم نہ دیں، آپ ان کے خلاف

بغاوت نہیں کر سکتے، وہاں ایسی احادیث بھی تو موجود ہیں کہ جب ایسے لوگ برسرِ اقتدار ہوں جن کی روش یہ ہو کہ "یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یؤمرون"[۱] تو ان کے خلاف بندۂ مومن کا ردِّ عمل کیا ہونا چاہیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن! اگر بغاوت نہیں ہو سکتی تو یہ جہاد بالید کس شے کا نام ہے؟ اگر ان کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تو یہ الفاظ حضورؐ نے کیوں استعمال کیے؟ فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن، ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل۔

ہمارے ہاں اس فکر کو دراصل عام طور پر اہلحدیث علماء نے عام کیا ہے، ورنہ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہی ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہو سکتی ہے۔ علماء حدیث اور فقہا میں یہی تو فرق ہے کہ عالم حدیث کی زیادہ توجہ حدیث کے الفاظ پر ہوتی ہے، جبکہ فقیہہ حدیث کے مفہوم کو مرکزِ توجہ بناتا ہے۔ وہ احادیث کو جمع کرتا ہے، ان کا تقابل کرتا ہے اور پھر کوئی نتیجہ نکالتا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کو پہلے سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبانی طور پر کیجیے۔ اگر اس کا اثر نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے انہیں سیدھا کیجیے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے اندر اس بات کی اجازت موجود ہے۔ البتہ امام صاحبؒ نے اس کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ طاقت اتنی فراہم ہو جانی چاہیے کہ کامیابی یقینی ہو جائے، یا کم از کم اس کا ۵۱ فیصد امکان ہو۔ یہ نہیں کہ چند آدمی کھڑے ہو کر نعرہ لگائیں اور پھانسی چڑھ جائیں۔ اور بات ختم ہو جائے۔ بلکہ پہلے دعوت تنظیم اور تربیت کے ذریعے آپ ایسی منظم قوت فراہم کر لیں،

---

[۱] حضرت ابن مسعودؓ ہی سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں: سیکون امراء بعدی یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یؤمرون (مسند احمد، حدیث ۴۳۶۳) ترجمہ: "عنقریب میرے بعد ایسے امراء (حکام) آئیں گے جو کہیں گے وہ بات جس پر عمل نہیں کریں گے اور کریں گے وہ کچھ جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔"

پھر آپ انتہائی قدم بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے دین میں بغاوت حرام نہیں ہے۔ اس معاملے میں میری رائے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف کتاب وسنّت سے اقرب ہے۔

اس دَور میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے، بغاوت کا ایک بدل ALTERNATIVE سامنے آیا ہے اور اب طاقت کا استعمال مسلح تصادم کے بغیر بھی ممکن ہے۔ وہ یہ کہ میدان میں نکل کر اس طرح کے بھرپور مظاہرے اور PICKETING کرنا کہ حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑ جائیں! آپ کو یاد ہوگا کہ ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء کو ابھی صرف تین برس بھی نہیں ہوتے تھے، جب اہلِ تشیّع نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا تھا اور اس جاندار مارشل لاء کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ناک رگڑوالی تھی۔ اسے ان کے تمام مطالبات ماننے پڑے تھے۔ اور ایرانی شیعوں نے تو اس دَور کی سب سے بڑی مثال قائم کر کے دکھا دی۔ انہوں نے منظّم مظاہرے کیے، لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے اور ہزاروں کی تعداد میں جانیں قربان کر دیں۔ خاص طور پر اُس روز جس دن شاہ نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا، کتنے ہزار ایرانیوں کے لاشے میدان میں پڑے تڑپ رہے تھے ـــــــ اور شہنشاہِ ایران کو اپنی لاکھوں کی فوج اور حلیفوں کی حمایت کے باوجود اس طرح راہِ فرار اختیار کرنا پڑی کہ ع

دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!

نہی عن المنکر میں اوّلین ہدف ـــــ فتنۃ النساء

ہم اپنے معاشرے میں پھیلے ہوئے منکرات کا جائزہ لیں تو ان میں ایک بہت بڑا منکر آزادئ نسواں کا فتنہ ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ (متفق علیہ)

"میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں کے فتنے سے زیادہ نقصان دہ فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑا۔"

ہمارے معاشرے میں اس "فتنۃ النساء" نے درحقیقت بہت سی گندگی پھیلائی ہے۔ عورتوں کا نشوز، ان کا تبرّج، ان کا بن سنور کر نکلنا اور اخبارات کا ایسی حیاباختہ عورتوں کی تصویروں کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑا اُٹھا لینا واقعۃً اس وقت ہمارے معاشرے کا ایک بہت تباہ کُن فتنہ ہے اور یہ ایسا بڑا منکر ہے جس کے خلاف اقدام کی ضرورت ہے۔ نہی عن المنکر کے ضمن میں یہ بات جان لیجئے کہ ہمیں یقیناً ایک تدریج سے چلنا ہوگا اور اس تدریج میں سب سے مقدم اس فتنۃ النساء کی سرکوبی ہے' اس لیے کہ معاشرے کے اندر سب سے زیادہ اثر اسی کا پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں دوسرے منکرات بھی موجود ہیں اور ہمیں ان سب سے نبرد آزما ہونا ہے۔ مثال کے طور پر سُود ایک بہت بڑا منکر ہے' زمینداریاں، جاگیرداریاں اور تقسیمِ دولت کا غلط نظام یہ سب ایسے منکرات ہیں جن کی بیخ کنی کرنا ہے لیکن چونکہ ہمارے دین میں سب سے زیادہ تفصیلات عائلی قوانین اور نظامِ معاشرت کے بارے میں ہیں اور یہ معاملہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے' لہٰذا اوّلین ترجیح اسی کو حاصل ہوگی۔ اور اسلام کا عائلی اور معاشرتی نظام ہی وہ چیز ہے جسے ہمارے عوام سب سے زیادہ جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں۔ لہٰذا منکرات کے خلاف ہماری تحریکِ مزاحمت (RESISTANCE MOVEMENT) جب بھی اُٹھے گی اس کا آغاز اسی سے ہوگا!

پچھلے دنوں ہمارے ہاں اس فتنۃ النساء کے بعض ایسے مظاہر سامنے آئے ہیں جو ایک عجیب تضاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک طرف تو عورتوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں برابری کے حقوق دیئے جائیں مثلاً میڈیکل کالجوں میں داخلہ اوپن میرٹ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اگر لڑکی کے نمبر زیادہ ہیں تو اس کا حق ہے کہ اس کو داخلہ ملے۔ یورپ کی نقالی میں مساواتِ مرد وزن کا مطالبہ کرنے والی خواتین کو اس مساوات کا نمونہ یورپ میں جاکر دیکھنا چاہیے کہ کوئی بوڑھی نحیف عورت بس میں کھڑی ہوگی اور کوئی جوان آدمی بھی اس کے لیے اپنی سیٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ وہاں کی عورت برابر کے حقوقِ شہریت رکھتی ہے اور اس کو اُس معاشرے میں کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں ملتی۔ لیکن ہمارے ہاں مساواتِ مرد وزن کے نعرے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف حال یہ ہے کہ اسمبلی میں خواتین کی نشستیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر برابری کا معاملہ ہے تو یہ کیوں میدان میں آکر الیکشن نہیں لڑتیں ہے اگر ان کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ الیکشن

لڑنے کی اجازت بھی رکھی گئی ہے تو پھر ان کی علیحدہ نشستوں کے کیا معنی؟ اگر بے نظیر عام الیکشن لڑ کر ایک سے زائد جگہ سے کامیاب ہوسکتی ہیں اور اگر عابدہ حسین مردوں کے مقابلے میں الیکشن جیت سکتی ہیں تو باقی خواتین اسی راستے سے کیوں نہیں آتیں؟ اور آپ نے یہ طرفہ تماشا ملاحظہ کیا کہ اس نئی حکومت کے قیام سے لے کر اب تک حکومت اور اپوزیشن کے مابین جس واحد بات پر اتفاق رائے ہوا ہے وہ یہی ہے کہ عورتوں کی علیحدہ نشستوں کا معاملہ برقرار رکھا جائے! ناطقہ سر بگریباں ہے . . . ! اس عرصے میں اور کسی پہلو سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، کسی اور معاملے پر حکومت اور اپوزیشن کا اتفاقِ رائے نہیں ہوا حتیٰ کہ اب تک کسی قسم کی کوئی قانون سازی بھی نہیں ہو سکی، لیکن اس ایک معاملے میں، جو اسلام کے مزاج کے صریحاً خلاف ہے، فریقین کا اتفاق رائے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے تمدّنی تصورات میں کوئی فرق نہیں، ان کی ذہنیتیں ایک سی ہیں، حکومت ہو یا اپوزیشن جدید مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب میں دونوں رنگے ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں، لہٰذا اس مسئلے پر ان میں اتفاق ہے۔ اور ہمارے مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب نے تو عورتوں کی نشستیں ایک دم دوگنی کر دی تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے! اور کمال یہ ہے کہ اگرچہ اس مسئلے پر مولانا سمیع الحق صاحب کا بیان آیا ہے اور انہوں نے اسے غیر اسلامی اور مغربی تہذیب کا مظہر قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ اس کے باوجود ہم مسلم لیگ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ تو وہی روش ہوئی جس سے ان آیات اور احادیث میں روکا گیا ہے کہ غلط بات کو غلط بھی کہنا لیکن ساتھ پھر بھی دیتے رہنا۔ اگر یہ غلط ہے تو غلط کا ساتھ کاہے کو دے رہے ہیں؟ ان سے ترکِ تعلق کیوں نہیں کرتے؟

اس بارے میں میرا موقف بالکل واضح ہے اور میں بارہا اسے بیان کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک اس طرح کی مخلوط اسمبلیوں میں کسی عورت کا رکنِ اسمبلی ہونا ہی اسلام کے خلاف ہے۔ اگر آپ عورت کے وزیر اعظم ہونے پر اعتراض کرتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ عورت کا وزیر ہونا بھی تو قابلِ اعتراض ہے۔ اس کا تو کام ہے کہ گھر کے اندر اپنی ذمہ داریاں سنبھالے۔ اسلام مرد اور عورت کے لیے الگ الگ دائرۂ کار متعیّن کرتا ہے۔ آپ خواتین کو اسمبلی میں لانا چاہتے

ہیں تو ان کے لیے علیحدہ اسمبلی بنا دیں۔ خواتین ووٹر ہی خواتین ارکانِ اسمبلی کا انتخاب کریں اور وہ ان کی نمائندہ بن کر اپنی علیحدہ اسمبلی میں بیٹھیں۔ اور یہ طے کر دیا جائے کہ جو بھی قانون سازی ہو وہ پہلے مردوں کی اسمبلی سے پاس ہو اور اس کے بعد اگر اسے خواتین کی اسمبلی سے بھی اکثریت ملے تب وہ کامیاب قرار دی جائے۔ اسی طرح میڈیکل کی تعلیم کے لیے بھی خواتین کے علیحدہ کالج بنائے جائیں، جن کا اپنا میرٹ ہو۔ اس وقت ہمارے پاس اتنی خواتین پروفیسرز اور ڈاکٹرز موجود ہیں کہ وہ پورے پورے کالج چلا سکتی ہیں۔ اسی طرح خواتین کے ہسپتال بھی علیحدہ ہوں جہاں سے ان کی تعلیمی ضروریات پوری ہو سکیں۔ تاہم یہ سب کچھ اسی وقت ہوگا جب مغربی تہذیب کا بھوت سر سے اُترے گا۔ لیکن اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں تو ٹھیک ہے، انہیں ہر معاملے میں برابری کا حق دیجئے کہ پھر وہ کھلم کھلا میدان میں آکر الیکشن بھی لڑیں اور اوپن میرٹ پر داخلہ بھی حاصل کریں! بہرحال یہ دو طرفہ معاملہ قابلِ قبول نہیں ہے کہ ایک طرف تو اسمبلی کی سطح پر خواتین کی مخصوص نشستیں ہوں اور ان کا بالواسطہ (INDIRECT) الیکشن ہو رہا ہو، اور دوسری طرف میڈیکل کالجوں کے داخلے میں اوپن میرٹ کا معاملہ کیا جائے کہ لڑکے لڑکیاں سب کو برابری کی بنیاد پر داخلہ مل سکے۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ان طالبات کی اکثریت شادی کے بعد میڈیکل پروفیشن کو تج دیتی ہے۔ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو پھر ساری عمر شادی نہیں کرتیں، لیکن ظاہر بات ہے یہ ایک خلافِ فطرت زندگی ہے جو ہمارے دین کے مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ اور یہ اُن چیزوں میں سے ہے جن کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے: مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ" جسے میری سنّت پسند نہیں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے"! معلوم ہوا کہ یہ چیزیں پسندیدہ نہیں ہیں۔ لیکن چلیے اگر یہی کچھ کرنا ہے تو آپ ہمیں دو طرفہ مار تو نہ ماریں۔! دین کے اعتبار سے تو یہ دونوں چیزیں غلط ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ دو طرفہ پالیسی خود ان کے اپنے موقف اور اپنے معیارات کے اعتبار سے بھی تضاد پر مبنی ہے۔ اس تضاد کو رفع ہونا چاہیے۔!

مَیں نے یہاں اس کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ مولانا سمیع الحق صاحب نے اس کو غلط اور غیر اسلامی کہنے کے باوجود یہ بھی کہا کہ ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس طرح تو برائی

کو بُرائی کہنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اللہ تعالیٰ مجھے سوئے ظن سے بچائے، یہ تو ایک ایسی کوشش معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اس کھاتے میں بھی نام لکھوا دیا جائے کہ ہم نے بُرائی کو بُرائی کہا ہے لیکن دوسری طرف اپنی سیاسی مصلحت پر بھی آنچ نہ آئے۔ حدیثِ نبوی تو یہ بتا رہی ہے کہ بُرائی کو بُرائی کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ "وَنَخْلَعُ وَ نَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ" کے مصداق جو لوگ بُرائی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں اُن سے قطع تعلق کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر ازروئے فرمانِ نبوی دل بھی باہم مل جائیں گے، جڑ جائیں گے۔ اور سب کے دلوں پر ایک سا رنگ چڑھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے!!

عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ

یہ ہماری آج کی گفتگو کا آخری موضوع ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے قرآن حکیم کے دو مقامات کا انتخاب کیا ہے، جن سے واضح ہوتا ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے تو اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے جاتے ہیں جو آخری وقت تک نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ ورنہ گیہوں کے ساتھ بالعموم گھُن بھی پس جاتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (الانفال: ۲۵) کہ لوگو، بچتے رہو اللہ کے اُس عذاب سے جو تم میں سے صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا جو بدکار تھے۔ بلکہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو دوسرے لوگ بھی، جو اگرچہ اُس حرام خوری میں ملوث نہ ہوں، اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اس سے بچاؤ کی ضمانت صرف ان کے لیے ہے جو نہی عن المنکر کے فریضے کو آخری وقت تک سرانجام دیتے رہیں۔ چنانچہ فرمایا:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ
وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

(ھود: ۱۱۶)

"سو کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں کچھ ایسے لوگ جن میں خیر کا اثر باقی رہ گیا تھا کہ وہ زمین میں فساد سے منع کرتے رہتے، مگر تھوڑے کہ جنہیں ہم نے بچا لیا اُن میں سے۔ اور پیچھے پڑے رہے ظالم اُسی چیز کے جس میں اُنہیں عیش ملا اور تھے وہ گناہ گار!"

یعنی پہلی قوموں میں سے جن لوگوں نے آخری دم تک یہ شرط پوری کی کہ وہ نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے، اللہ نے انہیں عذاب سے بچا لیا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ شرط پوری نہیں کی وہ اُسی عذاب یافتہ قوم کے ساتھ لپیٹ میں لے لیے گئے۔ اس آیت کا آخری ٹکڑا بڑا عجیب ہے۔ اگر آپ اپنے اس وقت کے معاشرے کو بھی دیکھیں تو وہی نقشہ نظر آئے گا جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ ــــ" اور وہ لوگ جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی تھی وہ اسی طور طریقے کے پیچھے پڑے رہے جس میں انہیں دولت و ثروت حاصل ہوئی تھی"۔ دن رات ایک ہی فکر ہے، ایک ہی دُھن سوار ہے اور ایک ہی سوچ طاری ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لی جائے اور پھر اپنے اللوں تللوں، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں اسراف و تبذیر کے ذریعے اس دولت کی بھرپور نمائش کی جائے۔ فرمایا: وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ــــ" اور وہ سب مجرم تھے"! اور اسی جرم کی پاداش میں ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ بہرحال اس وقت اس پوری آیت کا درس دینا مقصود نہیں، صرف" اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ "کے اعتبار سے حوالہ دیا جا رہا ہے کہ ان میں بہت ہی قلیل تعداد میں وہ لوگ تھے جو برائی سے روکتے رہے اور انہی کو ہم نے نجات دے دی! یہی مضمون سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۶۵ میں بھی وارد ہوا ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

"پس جب انہوں نے بھلا دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بُرائی سے، اور پکڑا گنہگاروں کو بُرے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے!"

اس آیۂ مبارکہ میں یہود کے ایک قبیلے کا ذکر ہے جو ساحلِ سمندر پر آباد تھا۔ یہود کو سبت (ہفتہ) کا پُورا دن یادِ الٰہی میں بسر کرنے کی ہدایت تھی اور اس روز ان کے لیے کسی دنیوی کاروبار کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے سبت کے قانون کو توڑنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا کہ ہفتہ کے روز مچھلیاں پکڑتے تو نہیں تھے، لیکن سارا دن ساحل کے ساتھ ساتھ کھدائی کرتے رہتے اور بڑے بڑے گڑھے بنا کر ان میں سمندر کا پانی لے آتے تھے جن میں مچھلیاں بھی آ جاتی تھیں۔ اگلے روز اتوار کو جا کر وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے تھے۔ گویا کہ سبت کے قانون کے اصل مقصد یعنی عبادت و ریاضت، ذکر و فکر، دعا و مناجات اور تلاوتِ کتابِ الٰہی کو یکسر نظر انداز کر کے اس کے بجائے سارا دن دنیا کے دھندے میں لگے رہتے، لیکن قانونی طور پر اس حیلے کا سہارا لیتے اور صاف صاف کہتے کہ ہم تو سبت کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم ہفتہ کو تو مچھلیاں نہیں پکڑتے، بلکہ اتوار کو پکڑتے ہیں۔ اس پر وہ قوم تین حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ وہ تھا جو اس جرم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اگرچہ اس جرم میں ملوّث نہیں تھے اور اس کام کو غلط بھی سمجھتے تھے، لیکن وہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کو روک ٹوک کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ گویا نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام نہیں دے رہے تھے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو اللہ کے فضل و کرم سے خود بھی اس نافرمانی سے بچے ہوئے تھے اور جو لوگ یہ غلط روش اختیار کیے ہوئے تھے انہیں وہ روکتے ٹوکتے بھی تھے۔ اس سے پہلی آیت (نمبر ۱۶۴) میں ان میں سے دوسری قسم کے لوگوں کا قول بیان ہوا ہے: لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا "کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے؟" یعنی اللہ تعالیٰ تو اب ان کو ہلاک کر کے رہے گا، یہ قوم اب باز آنے والی نہیں ہے، تم خواہ مخواہ انہیں روکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہے ہو؟ کیوں ان کے پیچھے لگے ہوتے ہو اور اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہو؟ ان کا جواب تھا: مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ "تمہارے ربّ کے حضور عذر پیش کرنے کی غرض سے اور شاید کہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر ہی لیں!" یعنی ہم تو اپنا نہی

عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے کیونکہ ہمیں تو اللہ کے حضور معذرت پیش کرنی ہے کہ اے اللہ ہم تو انہیں آخری وقت تک روکتے رہے، ہم اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ اور پھر کیا عجب کہ ہمارے سمجھانے سے اللہ کسی کے دل میں تقوٰی پیدا کر دے اور اسے اپنا طرزِ عمل بدلنے کی توفیق عطا فرما دے! اب اس کے بعد فرمایا گیا: فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ ـــــ "تو جب انہوں نے نظر انداز کر دیا اس ساری نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی"۔ ان تک جو بھی نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا جا رہا تھا، اس سے ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ ـــــ "ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے رہے تھے"۔ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ "اور جو لوگ ظلم کی روش اختیار کیے ہوئے تھے انہیں ہم نے ایک بہت بُرے عذاب میں پکڑ لیا بسبب اس کے کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے!"

قرآنِ حکیم کے یہ دو مقامات ہیں جن کی رُو سے عذابِ الٰہی سے نجات کی ضمانت صرف اُن لوگوں کو ملتی ہے جو نہی عن المنکر کا فریضہ آخری وقت تک سرانجام دیتے رہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کا اثر ہو یا نہ ہو، لوگ مانیں یا نہ مانیں!!

آخر میں اسی مضمون سے متعلق ایک حدیث کا مطالعہ کر لیجیے۔

اس حدیث کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ وہ حذیفہؓ ہیں جو "صاحبُ سِرِّ النَّبِیِّ" (نبیؐ کے رازدان) کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر انہیں بعض افراد کے بارے میں نام بنام بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حذیفہ یہ میرا ایک راز ہے، اسے کسی کو بتانا نہیں! اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے نفاق کا پردہ چاک نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ عبداللہ ابن اُبَی کی نمازہ جنازہ بھی پڑھا دی جو کہ منافقین کا سردار تھا۔ میرے دروس میں یہ مضمون بڑی تفصیل سے آچکا ہے کہ اسلامی ریاست میں CATEGORIES بس دو ہی ہیں ـــــ مسلم اور غیر مسلم۔ باقی رہے منافق تو وہ قانونی طور پر مسلمان ہی شمار ہوتے ہیں۔ بہرحال حضورؐ نے

چونکہ انہیں ایک راز کے طور پر منافقین کے نام بتا دیئے تھے اس لیے ان کا نام "صاحبُ سرّ النبیؐ" پڑ گیا تھا۔ اور یہاں یہ بھی نوٹ کیجئے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا تھا: "اے حذیفہؓ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھ رہا ہوں، کہیں میرا نام تو ان میں نہیں تھا؟" اپنے ایمان کے بارے میں اس درجے احساس تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، کہ کہیں اس دولتِ ایمان پر نفاق کا ڈاکہ نہ پڑ جائے! اور ہم اس درجے بے پرواہیں کہ ہمیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں، ہمیں تو اپنے مومنِ حقیقی ہونے پر مکمل یقین حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاحِ احوال کی توفیق عطا فرمائے!

عَنْ حُذَیْفَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلّی اللہ علیه وسلّم قال:

حضرت حذیفہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ

تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا

اَوْ لَیُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ

ورنہ پھر اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی جانب سے ایک بڑا شدید عذاب بھیجے گا

ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَكُمْ

پھر تم اسے پکارو گے، لیکن تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی۔

رَوَاهُ التِّرْمِذِیّ وَقَالَ حَدِیْثٌ حَسَنٌ

اسے روایت کیا امام ترمذیؒ نے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے حالات کا جائزہ لیجئے۔ آج اس کا کیا سبب ہے کہ ہم اللہ کے حضور دعائیں کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں لیکن فتنے ہیں کہ پھیلتے ہی جارہے ہیں، فساد کی آگ بڑھتی ہی جارہی ہے، امن و امان ختم ہوچکا ہے، رات کا چین اور دن کا اطمینان رخصت

ہو چکا ہے' بالفاظِ قرآنی : ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ "بحر و بر میں فساد پھیل چکا ہے" لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ اللہ کے عذاب کی ایک صورت ہے اور نہ ہی ہمیں اس کی فکر ہے کہ اس عذاب سے بچنے کا راستہ کون سا ہے!!

آج کے درس کا حاصل یہ ہے کہ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے نہی عن المنکر! اس کا کم سے کم درجہ جسے اختیار کرنا دنیاوی عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے وہ 'باللسان' ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جدوجہد کی جائے اور ایسی جمعیت اور قوت فراہم کی جائے جو نہی عن المنکر بالید کا فریضہ سر انجام دے سکے۔ یہی دو کام ہیں جو ہم اللہ کی تائید و توفیق سے کر رہے ہیں۔ انجمن خدام القرآن کی سطح پر قرآن کی یہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تعلّم اور نشر و اشاعت ——— اور پھر تنظیم اسلامی کے نام سے ایک قوت فراہم کرنے کی کوشش! اللہ تعالیٰ کو جیسے کچھ منظور ہوگا، جب منظور ہوگا، اس کے نتائج ظاہر ہو جائیں گے۔ ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ہم "قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ" کے مصداق اللہ کی جناب میں ایک معذرت پیش کرنے کے قابل ہو جائیں اور پھر کیا معلوم کہ کب اللہ تعالیٰ کسے توفیق عطا فرما دیں۔ کل کی کسے خبر ہے؟ کون کہہ سکتا تھا کہ عمرؓ جو اپنے گھر سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے چلا تھا، وہ ان کی خدمت میں اپنی تلوار اپنے گلے میں لٹکا کر حاضر ہو جائے گا، جیسے غلام لٹکایا کرتے تھے۔ حالات کو بدلتے ہوئے اللہ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہرگز کسی غفلت یا تساہل کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ آج ہم نے جن آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ کا مطالعہ کیا ہے، ان سب کے متن پر مشتمل ایک ڈیڑھ ورقہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ پڑھیے، اسے حرزِ جان بنا لیجئے اور اس سے آپ پر جو بھی حقیقت منکشف ہو اس پر اللہ تعالیٰ سے عمل کی توفیق طلب کیجیے!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

ضمیمہ

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام
اور عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

المائدہ: آیات ۶۲، ۶۳

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

المائدہ: آیات ۷۸ تا ۸۱

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

ہود: آیت ۱۱۶

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

الاعراف: آیت ۱۶۵

عن أبي سعيد الخُدْرِيّ رضى الله عنه قال سَمِعْتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يَقُولُ: «مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ أضعف الإِيمَانِ» رواه مسلم.

عن ابن مَسْعُود رضى الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ» رواه مسلم.

عَن ابن مَسْعُودٍ رضى الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : « إنَّ أَوَّلَ مَا دَخَلَ النَّقْصُ عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ كَانَ الرَّجُلُ يَلْقَى الرَّجُلَ فَيَقُولُ : يَا هٰذَا اتَّقِ اللهَ وَدَعْ مَا تَصْنَعُ فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ لَكَ ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ وَهُوَ عَلَى حَالِهِ فَلَا يَمْنَعُهُ ذٰلِكَ أَنْ يَكُونَ أَكِيلَهُ وَشَرِيبَهُ وَقَعِيدَهُ فَلَمَّا فَعَلُوا ذٰلِكَ ضَرَبَ اللهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ » ثُمَّ قَالَ : ﴿ لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ ﴾ إِلَى قوله ﴿ فَاسِقُونَ ﴾ ثُمَّ قَالَ : « كَلَّا وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلَى يَدِ الظَّالِمِ وَلَتَأْطِرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللهُ بِقُلُوبِ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ » رواه أبو داود ، والترمذى وقال : حديث حسن . هذا لفظ أبي داود ، وَلفظ الترمذى قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لَمَّا وَقَعَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ فى الْمَعَاصِي نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوا فَجَالَسُوهُمْ فى مَجَالِسِهِمْ وَوَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ فَضَرَبَ اللهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ » فَجَلَسَ رسول الله صلى الله عليه وسلم وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ : لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ حَتَّى تَأْطِرُوهُمْ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا » . قَوْلُهُ « تَأْطِرُوهم » : أَيْ تَعْطِفُوهُمْ . « وَلَتَقْصُرُنَّهُ » : أَيْ لَتَحْبِسُنَّهُ . »

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : " بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی دوسرے

سے ملاقات پر کہتا تھا: "اے فلاں، اللہ سے ڈرو، اور جو کام تم کر رہے ہو اسے چھوڑ دو، اس لیے کہ وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔" لیکن پھر جب ان کی اگلے روز ملاقات ہوتی تھی تو اس کے باوجود کہ وہ شخص اپنی اُسی روش پر قائم ہوتا تھا یہ بات اس پہلے شخص کو اس کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور مجالست سے نہیں روکتی تھی، تو جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ نے اُن کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا۔" اس کے بعد آپؐ نے آیاتِ قرآنی (سورۃ مائدہ ۷۸ تا ۸۱) "لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ سے فَاسِقُوْنَ" تک تلاوت فرمائیں اور پھر فرمایا: "ہرگز نہیں! خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور بدی سے روکنا ہوگا اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لینا ہوگا، اور اسے جبراً حق کی جانب موڑنا اور اس پر قائم رکھنا ہوگا ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مانند کر دے گا اور پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت فرمائے گا جیسے اُن پر کی تھی۔" اس حدیث کو روایت کیا امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے۔ متذکرہ بالا الفاظ روایتِ ابی داؤدؒ کے ہیں۔ روایتِ ترمذیؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو (ابتدا میں) اُن کے علماء نے اُن کو ان سے روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور (اس کے باوجود) انہوں نے اُن کی ہم نشینی اور باہم کھانا پینا جاری رکھا تو اللہ نے ان کے دل بھی باہم مشابہ کر دیئے اور پھر ان پر داؤد اور عیسٰی ابن مریم (علیہما السّلام) کی زبانی لعنت فرمائی اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے۔" اس کے بعد آنحضور اُٹھ کر بیٹھ گئے دراں حالیکہ اس سے قبل آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے اور پھر آپؐ نے فرمایا: "نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب تک تم اُن کو حق کی جانب موڑ نہ دو گے (تمہاری ذمّہ داری ادا نہ ہوگی)" امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے!

■

عَنْ حُذَيْفَةَ رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ الله أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَاباً مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ»

رواه الترمذى وقال: حديث حسن.

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

باہم لازم و ملزوم

ایک گاڑی کے دو پہیے یا ایک ہی تصویر کے دو رُخ

(۱) شانِ باری تعالےٰ ـــــ النحل ۹۰

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

(۲) تقاضائے فطرت و حکمت ـــــ لقمٰن ۱۷

يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۱۷﴾

(۳) شانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ الاعراف ۱۵۷

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

(۴) شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم ـــــ التوبہ ۷۱

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(۵) صالحین اہلِ کتاب کے اوصاف

آلِ عمران ۱۱۳-۱۱۴

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيٰتِ اللّٰهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ وَأُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۱۱۴﴾

(۶) کیفیتِ منافقین ـــــ التوبہ ۶۷

الْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ

(۷) اُمّت کا فرضِ منصبی ـــــ آلِ عمران ۱۱۰

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

(۸) اُمّتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل کا نقطۂ عروج ـــــ آلِ عمران ۱۰۲تا۱۰۴

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيٰتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾

(۹) اصحابِ اقتدار کا فرضِ عین ـــــ الحج ۴۱

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿۴۱﴾

(۱۰) سرفروش اور جانباز اہلِ ایمان کے اوصاف کا ذروۂ سنام ـــــ التوبہ ۱۱۱تا۱۱۲

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۱۱﴾ التَّائِبُونَ الْعٰبِدُونَ الْحٰمِدُونَ السَّائِحُونَ الرّٰكِعُونَ السّٰجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۲﴾

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (القرآن)

اور سب مل کر اللہ کے دین کو مضبوط پکڑ لو

مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

تجویز فرمودہ

حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب قدس سرہٗ

مرتبہ

حضرت مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی دامت برکاتہم

ناشرانِ قرآن لمیٹڈ: اردو بازار لاہور

مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شغف اور جدّوجہد کے نتیجے میں گذشتہ ساٹھ ستّر سال سے مخصوص انداز میں تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ جاری ہے جس سے باخبر طبقہ بخوبی واقف ہے۔ اس محنت اور جدّوجہد کے پیچھے آں محترم ہی کی فکر کارفرما ہے جو عرصۂ دراز کے تعامل سے مزید گہری اور پختہ ہوگئی ہے۔

مسلمانوں کے موجودہ زوال، انحطاط اور دین سے دوری بھی ایک طرح کی 'بیماری' ہے جس کا 'علاج' ہی دراصل آج امّت کے اکابرین کے لئے اصل کام ہے اور چونکہ نبی آخرالزماں محمد الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی امّت کسی خاص خطّے، رنگ اور نسل اور زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام روئے ارضی پر آباد نسلِ آدم علیہ السّلام پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس 'بیماری' کے 'علاج' کیلئے بھی نہ کوئی ایک ہی طریقِ علاج مطلوب ہے اور نہ کافی وشافی۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ فکر اور استدلال کو مولانا محمد احتشام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتابچے کی شکل دی تھی۔ ہمیں حیرت ہے کہ آج سے پون صدی قبل جبکہ ہر طرف انگریز کی غلامی کی ظلمت چھائی ہوئی تھی ایک مردِ خود آگاہ اور خدامست نے امّتِ مسلمہ کی 'بیماری' کی کیسی صحیح تشخیص فرمادی کہ آج بھی اس پر کوئی اصولی اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے (جزوی اضافہ یا تعبیر کا فرق الگ بات ہے)۔ مزید برآں صحیح تشخیص کے بعد 'علاج' بھی تجویز فرمایا اور ایک اصولی رہنمائی دیدی۔ تحریر ہے: "اب جبکہ مقصدِ زندگی واضح ہوگیا اور اصل مرض اور اس کے معالجے کی نوعیت معلوم ہوگئی تو طریقِ علاج کی تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی۔ اس نظریئے کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاءاللہ نافع اور سودمند ہوگا۔"

کتنی بصیرت افروز ہے یہ حقیقت کہ جیسے ایک ماہر سرجن اور طبیب کا دوسرے معالج سے مرض کی نوعیت کے بارے میں اتفاق کے باوجود طریقِ علاج میں بالعموم

اختلاف ہوتا ہے اور یہ ہمارا روزانہ کا تجربہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت مسلمہ کے 'معالجین' جو اکابر امت ہیں ان میں طریق علاج اور رند و جہد کی سمت کا فرق نہ غیر فطری ہے نہ پریشان کن۔

آں محترم کی کتنی عالی ظرفی ہے کہ جس طریق پر انہوں نے اپنی جماعت کو اٹھایا اور چلایا اس پر یقین کامل اور غیر متزلزل رسوخ کے باوجود 'دوسرے طریق علاج' کے لئے سینہ کشادہ رکھتے ہیں تحریر ہے:

"ہم نے اپنی نارسا فہم کے مطابق مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک نظام عمل تجویز کیا ہے جس کو فی الحقیقت اسلامی زندگی یا اسلاف کی زندگی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ جس کا اجمالی نقشہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔"

'بیماری' کی تشخیص میں علاوہ دیگر امور کے جس طرح 'نہی عن المنکر' کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسوس کہ وہ چیز آج اس مشن کے علمبرداروں میں نظر نہیں آتی۔ مثلاً حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی مشہور حدیث جس میں نہی عن المنکر کے تین درجے ہیں: ہاتھ سے برائی کا روکنا، زبان سے روکنا اور دل میں برا جاننا (اور خود رکنا) اور یہ دل میں برا جاننا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس کی وضاحت میں تحریر ہے۔ "اور یہ آخری صورت ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے۔ پس جس طرح آخری درجہ اضعف ایمان کا ہوا اسی طرح پہلا درجہ کمال دعوت اور کمال ایمان کا ہوا۔"

مولانا احتشام الحسن کی یہ دقیع تحریر 'تبلیغی نصاب' کا مستقل جزو ہے۔ افادۂ عام کے لیے اس تحریر کا عکس 'تبلیغی نصاب' کے جدید ایڈیشن سے حاصل کر کے جسے کتب خانہ شان اسلام اردو بازار نے شائع کیا ہے، ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ ٹائیٹل کے صفحے کا عکس ایک مختلف ایڈیشن سے حاصل کیا گیا ہے جو ناشران قرآن لمیٹڈ کا شائع کردہ ہے ——————— (ادارہ)

اِظہارِ حقیقت

نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُولِہِ الکَرِیمِ

سیّدی وَمولائی زبدۃُ الفضلاء، قدوۃُ العلماء حضرت مولانا محمدؐ الیاس صاحب دام مجدہٗ
کے خاص شغف اور انہماک اور دیگر بزرگانِ ملت اور علماءِ اُمّت کی توجہ اور برکت اور عملی جدوجہد سے ایک عرصہ سے مخصوص انداز میں تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ جاری ہے جس سے باخبر طبقہ بخوبی واقف ہے۔

مجھ بے علم اور سیاہ کار کو ان مقدس ہستیوں کا حکم ہوا کہ اس طرزِ تبلیغ اور اس کی ضرورت اور اہمیت کو قلمبند کیا جائے تاکہ سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہو اور نفع عام ہو جائے۔

تعمیل ارشاد میں یہ چند کلمات نذرِ قرطاس کیے جاتے ہیں جو ان مقدس ہستیوں کے دریائے علوم و معارف کے چند قطرے اور اس باغیچہ دینِ محمدیؐ کے چند خوشے ہیں جو انتہائی عجلت میں جمع کیے گئے ہیں اگر ان میں کوئی غلطی یا کوتاہی نظر سے گذرے تو وہ میری لغزشِ قلم اور بے علمی کا نتیجہ ہے۔ نظرِ لطف و کرم سے اس کی اصلاح فرمادیں تو موجبِ شکر و منّت ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل و کرم سے میری بداعمالیوں اور سیہ کاریوں کی پردہ پوشی فرمادیں اور مجھے اور آپ کو ان مقدّس ہستیوں کے طفیل سے اچھّے اعمال اور اچھے کردار نصیب فرمادیں اور اپنی رضا و محبّت اور اپنے پسندیدہ دین کی اشاعت اور اپنے برگزیدہ رسولؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی دولت سے سرفراز فرمادیں۔

مدرسہ کاشف العلوم
بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی

خاکپائے بزرگان
محمد احتشام الحسن
۱۸۔ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ
خَاتَمِ الۡاَنۡبِیَاءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاہِرِیۡنَ ط

آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل جب دنیا کفر و ضلالت، جہالت و سفاہت کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھی بطحا کی سنگلاخ پہاڑیوں سے رشد و ہدایت کا ماہتاب نمودار ہُوا اور مشرق و مغرب شمال و جنوب غرض دُنیا کے ہر ہر گوشہ کو اپنے نُور سے منور کیا اور ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں بنی نوع انسان کو اس معراج ترقی پر پہنچایا کہ تاریخِ اسلام اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور رشد و ہدایت صلاح و فلاح کی وہ مشعل مسلمانوں کے ہاتھ میں دی جس کی روشنی میں ہمیشہ شاہراہِ ترقی پر گامزن رہے اور صدیوں اس شان و شوکت سے دنیا پر حکومت کی کہ ہر مخالف قوت کو ٹکرا کر پاش پاش ہونا پڑا۔ یہ ایک حقیقت ہے جو ناقابلِ انکار ہے لیکن پھر بھی ایک پارینہ داستان ہے جس کا بار بار دہرانا نہ تسلی بخش ہے اور نہ کارآمد اور مفید۔ جبکہ موجودہ مشاہدات اور واقعات خود ہماری سابقہ زندگی اور ہمارے اسلاف کے کارناموں پر بدنما داغ لگا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ زندگی کو جب تاریخ کے اوراق میں دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم عزّت و عظمت، شان و شوکت، دبدبہ و حشمت کے تنہا مالک اور اجارہ دار ہیں، لیکن جب ان اوراق سے نظر ہٹا کر موجُودہ حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو ہم انتہائی ذلت و خواری افلاس و ناداری میں مُبتلا نظر آتے ہیں نہ زور و قوّت ہے نہ زر و دولت ہے نہ شان و شوکت ہے، نہ باہمی اُخوّت و اُلفت۔ نہ عادات اچھی نہ اخلاق اچھّے نہ اعمال اچھے نہ کردار اچھّے۔ ہر برائی ہم میں موجود اور ہر بھلائی سے کوسوں دُور، اغیار ہماری اس زبوں حالی پر خوش ہیں اور برملا ہماری کمزوری کو اچھالا جاتا ہے اور ہمارا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اسی پر بس نہیں بلکہ خود ہمارے جگر گوشے نئی تہذیب کے دل دادہ نوجوان اسلام کے مقدّس اصولوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، بات بات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور اس شریعتِ مقدّسہ کو ناقابلِ عمل، لغو اور بے کار گردانتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ جس قوم نے دنیا کو سیراب کیا وُہ آج کیوں تشنہ ہے؟ جس قوم نے دنیا کو تہذیب و تمدّن کا سبق پڑھایا۔ وُہ آج کیوں غیر مہذّب اور غیر متمدّن ہے۔

رہنمایانِ قوم نے آج سے بہت پہلے ہماری اس حالتِ زار کا اندازہ لگایا اور مختلف طریقوں پر ہماری اصلاح کے لیے جد و جہد کی مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آج جب کہ حالت بد سے بدتر ہو چکی اور آنے والا زمانہ، ماسبق سے بھی زیادہ پر خطر اور تاریک نظر آرہا ہے۔ ہمارا خاموش بیٹھنا اور عملی جدّ و جہد نہ کرنا ایک ناقابلِ تلافی جُرم ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی عملی قدم اٹھائیں ضروری ہے کہ ان اسباب پر غور کریں جن کے باعث ہم اس ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔ ہماری اس پستی اور انحطاط کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں اور ان کے ازالہ کی متعدّد تدابیر اختیار کی گئیں لیکن ہر تدبیر ناموافق و ناکام ثابت ہوئی جس کے باعث ہمارے رہبر بھی یاس و ہراس میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اب تک ہمارے مرض کی تشخیص ہی پورے طور پر نہیں ہوئی یہ جو کچھ اسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل مرض نہیں، بلکہ اس کے عوارض ہیں۔ پس تاوقتیکہ اصل مرض کی جانب توجہ نہ ہوگی اور مادۂ حقیقی کی اصلاح نہ ہوگی۔

عوارض کی اصلاح ناممکن اور محال ہے۔ پس جب تک کہ ہم اصل مرض کی ٹھیک تشخیص اور اس کا صحیح علاج معلوم نہ کرلیں۔ ہمارا اصلاح کے بارے میں لب کشائی کرنا سخت ترین غلطی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہماری شریعت ایک مکمل قانونِ الٰہی ہے جو ہماری دینی اور دنیوی فلاح و بہبود کا تاقیامِ قیامت ضامن ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود ہی اپنا مرض تشخیص کریں اور خود ہی اس کا علاج شروع کردیں۔ بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآنِ حکیم سے اپنا اصل مرض معلوم کریں اور اسی مرکزِ رشد و ہدایت سے طریقِ علاج معلوم کرکے اس پر کاربند ہوں۔ جب قرآنِ حکیم قیامت تک کے لیے مکمل دستور العمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نازک حالت میں ہماری رہبری سے قاصر رہے۔

مالکِ ارض و سما، جل و علا کا سچا وعدہ ہے کہ رُوئے زمین کی بادشاہت و خلافت

مومنوں کے لیے ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّہُمْ فِی الْاَرْضِ (نور ع ۶)

اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا خلیفہ بنائے گا اور یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ مومن ہمیشہ کفار پر غالب رہیں گے اور کافروں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

وَلَوْ قٰتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (فتح ع ۳)

اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے پھر نہ پاتے کوئی یار و مددگار اور مومنوں کی نصرت اور مدد اللہ تعالیٰ کے ذمّہ ہے اور وہی ہمیشہ سربلند اور سرفراز رہیں گے۔

وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ

اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی اور تم

وَلَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران ع ۱۴)

ہمّت مت ہارو اور رنج مت کرو۔ اور غالب تم ہی رہوگے اگر تم پورے مومن رہے

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (منٰفقون ع ۱)

اور اللہ ہی کی ہے عزّت اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کی۔

مذکورہ بالا ارشادات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عزّت، شان و شوکت سربلندی و سرفرازی اور ہر برتری و خوبی ان کی صفتِ ایمان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ان کا تعلق خُدا اور رسولؐ کے ساتھ مستحکم ہے (جو ایمان کا مقصود ہے) تو سب کچھ ان کا ہے اور اگر خدانخواستہ اس رابطہ تعلق میں کمی اور کمزوری پیدا ہوگئی ہے تو پھر سراسر خسران اور ذلت و خواری ہے جیسا واضح طور پر بتلا دیا گیا۔

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر)

قسم ہے زمانہ کی انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے۔

ہمارے اسلاف عزّت کے منتہا کو پہنچے ہُوئے تھے اور ہم انتہائی ذلّت و خواری میں مُبتلا ہیں پس معلوم ہُوا کہ وہ کمالِ ایمان سے متّصف تھے اور ہم اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں جیسا کہ مخبرِ صادق صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔

سَیَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ۔

یعنی قریب ہی ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن کے صرف نقوش رہ جائیں گے۔

اب غور طلب امر یہ ہے اگر واقعی ہم اس حقیقی اسلام سے محروم ہو گئے جو خُدا اور رسول کے یہاں مطلوب ہے اور جس کے ساتھ ہماری دین و دنیا کی فلاح و بہبود وابستہ ہے تو کیا ذریعہ ہے جس سے وُہ کھوئی نعمت واپس آئے؟ اور وُہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے روحِ اسلام ہم میں سے نکال لی گئی اور ہم جسدِ بے جان رہ گئے۔

جب مصحفِ آسمانی کی تلاوت کی جاتی ہے اور "امۃ محمدیہ" کی فضیلت اور برتری کی علّت و غایت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس امّت کو ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا تھا جس کی وجہ سے "خیر الامم" کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا۔

دنیا کی پیدائش کا مقصدِ اصلی خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات و صفات کی معرفت ہے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے کہ جب تک بنی نوع انسان کو بُرائیوں اور گندگیوں سے پاک کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے ہزاروں رسول اور نبی بھیجے گئے اور آخر میں اس مقصد کی تکمیل کے لیے سیّد الانبیاء والمرسلین کو مبعوث فرمایا اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کا مژدہ سنایا گیا۔

اب چونکہ مقصد کی تکمیل ہو چکی تھی ہر بھلائی اور بُرائی کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا تھا۔ ایک مکمل نظامِ عمل دیا جا چکا تھا۔ اس لیے رسالت و نبوّت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ اور جو کام پہلے نبی اور رسول سے لیا جاتا تھا وہ قیامت تک "امۃ محمدیہ" کے سپرد کر دیا گیا۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران ع ۱۲)

اے اُمّتِ محمدیہ! تم افضل اُمّت ہو تم کو لوگوں کے نفع کے لیے بھیجا گیا ہے۔ تم بھلی باتوں کو لوگوں میں پھیلاتے ہو اور بُری باتوں سے ان کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

اور چاہیے کہ تم میں ایسی جماعت ہو کہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائے اور بھلی باتوں کا حکم کرے

الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران ع ۱۱)

اور بڑی بڑی باتوں سے منع کرے اور صرف وہی لوگ فلاح والے ہیں جو اس کام کو کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں "خیرِ امم" ہونے کی وجہ یہ بتلائی کہ تم بھلائی کو پھیلاتے ہو اور برائی سے روکتے ہو دوسری آیت میں حصر کے ساتھ فرمادیا کہ فلاح و بہبود صرف انہیں لوگوں کے لیے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ صاف طور پر بیان کر دیا کہ اس کام کو انجام نہ دینا لعنت اور پھٹکار کا موجب ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (مائدہ ع ۱۱)

بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر لعنت کی گئی تھی داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریمؑ کی زبان سے یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے۔ جو بُرا کام انہوں نے کر رکھا تھا اس سے باز نہ آتے تھے۔ واقعی ان کا یہ فعل بے شک بُرا تھا۔

اس آخری آیت کی مزید وضاحت احادیثِ ذیل سے ہوتی ہے۔

(۱) وَفِي السُّنَنِ وَالْمُسْنَدِ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانَ اِذَا عَمِلَ الْعَامِلُ فِيْهِمْ بِالْخَطِيْئَةِ جَآءَهُ النَّاهِيْ تَعْزِيْرًا فَقَالَ يَا هٰذَا اتَّقِ اللّٰهَ فَاِذَا كَانَ مِنَ الْغَدِ جَالَسَهٗ وَاَكَلَهٗ وَشَارَبَهٗ كَاَنَّهٗ لَمْ يَرَهٗ عَلٰى خَطِيْئَةٍ بِالْاَمْسِ فَلَمَّا رَاٰى عَزَّوَجَلَّ ذٰلِكَ مِنْهُمْ ضَرَبَ بِقُلُوْبِ بَعْضِهِمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں جب کوئی خطا کرتا تو روکنے والا اس کو دھمکاتا اور کہتا کہ خدا سے ڈر پھر اگلے ہی دن اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا۔ گویا کل اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہی نہیں، جب حق عزوجل نے ان کا یہ برتاؤ دیکھا تو بعض کے قلوب کو بعض کے ساتھ خلط کر دیا اور ان کے نبی داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریم علیہما

نَبِيِّهِمْ دَاوُدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ السَّفِيْهِ وَلَتَأْطُرُنَّ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ يَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

السلام کی زبانی ان پر لعنت کی اور یہ اس لیے کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کیا۔ قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے تم ضرور اچھی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے منع کرو اور چاہیے کہ بیوقوف نادان کا ہاتھ پکڑو اس کو حق بات پر مجبور کرو ورنہ حق تعالیٰ تمہارے قلوب کو بھی خلط ملط کر دیں گے اور پھر تم پر بھی لعنت ہو گی جیسا کہ پہلی امتوں پر لعنت ہوئی۔

(۲) وَفِيْ سُنَنِ اَبِيْ دَاوُدَ ابْنِ مَاجَةَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتُوْا

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص گناہ کرتا ہے اور وہ قوم باوجود قدرت کے اس کو نہیں روکتی تو ان پر مرنے سے پہلے ہی حق تعالیٰ اپنا عذاب بھیج دیتے ہیں یعنی دنیا ہی میں ان کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے

(۳) وَرَوَى الْاَصْبَهَانِيُّ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تَنْفَعُ مَنْ قَالَهَا وَتَرُدُّ عَنْهُمُ الْعَذَابَ وَالنِّقْمَةَ مَا لَمْ يَسْتَخِفُّوْا بِحَقِّهَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْاِسْتِخْفَافُ بِحَقِّهَا قَالَ يَظْهَرُ الْعَمَلُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَلَا يُنْكَرُ وَلَا يُغَيَّرُ۔

(۳) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیشہ کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اپنے پڑھنے والے کو نفع دیتا ہے اور اس سے عذاب و بلا دور کرتا ہے جب تک کہ اس کے حقوق کی بے پروائی نہ برتی جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا اس کے حقوق کی بے پروائی کیا ہے؟ حضور اقدس ﷺ

(ترغیب)

۴ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

عَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَرَفْتُ فِيْ وَجْهِهٖ اَنْ قَدْ حَضَرَهُ شَيْئٌ فَتَوَضَّأَ وَمَا كَلَّمَ اَحَدًا فَلَصِقْتُ بِالْحُجْرَةِ اَسْتَمِعُ مَا يَقُوْلُ فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لَكُمْ مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ قَبْلَ اَنْ تَدْعُوْا فَلَا اُجِيْبَ لَكُمْ وَتَسْاَلُوْنِيْ فَلَا اُعْطِيَكُمْ وَتَسْتَنْصِرُوْنِيْ فَلَا اَنْصُرَكُمْ فَمَا زَادَ عَلَيْهِنَّ حَتّٰى نَزَلَ۔

(ترغیب)

۵۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَظَّمَتْ اُمَّتِي الدُّنْيَا نُزِعَتْ مِنْهَا هَيْبَةُ الْاِسْلَامِ وَاِذَا تَرَكَتِ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ حُرِمَتْ بَرَكَةُ الْوَحْيِ وَاِذَا تَسَابَّتْ

نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی کھلے طور پر کی جائے پھر نہ ان کا انکار کیا جاتے اور نہ ان کے بند کرنے کی کوشش کی جاتے۔

(۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو میں نے چہرۂ انور پر ایک خاص اثر دیکھ کر محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے۔ حضورِ اقدس ص نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور وضو فرما کر مسجد میں تشریف لے گئے، میں مسجد کی دیوار سے لگ گئی تاکہ کوئی ارشاد ہو اس کو سنوں حضورِ اقدسؐ منبر پر جلوہ افروز ہُوئے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا۔" لوگو! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بھلی باتوں کا حکم کرو اور بُری باتوں سے منع کرو مبادا وہ وقت آجائے کہ تم دعا مانگو اور میں اس کو قبول نہ کروں اور تم مجھ سے سوال کرو اور میں اس کو پورا نہ کروں اور تم مجھ سے مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کروں۔ حضورِ اقدسؐ نے صرف یہ کلمات ارشاد فرمائے اور منبر سے اُتر گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری اُمّت دنیا کو قابلِ وقعت و عظمت سمجھنے لگے گی تو اسلام کی وقعت و ہیبت انکے قلوب سے نکل جائے گی۔

اُمَّتِی سَقَطَتْ مِنْ عَیْنِ اللّٰہِ۔ (کذا فی الدر عن الحکیم الترمذی)

اور جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی اور جب آپس میں ایک دوسرے کو سب وشتم کرنا اختیار کرے گی تو اللہ جل شانہٗ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

احادیث مذکورہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑنا خدا وحدہٗ لاشریک کی لعنت اور غضب کا باعث ہے اور جب امتِ محمدیہ اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب وآلام اور ذلت وخواری میں مبتلا کر دی جائے گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت ومدد سے محروم ہو جائے گی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ اُس نے اپنے فرضِ منصبی کو نہیں پہچانا اور جس کام کی انجام دہی کی ذمہ دار تھی اس سے غافل رہی یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور جزوِ لازمی قرار دیا اور اس کے چھوڑنے کو ایمان کے ضعف واضمحلال کی علامت بتلایا۔ حدیث ابوسعید خدریؓ میں ہے۔ مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔

یعنی تم میں سے جب کوئی شخص بُرائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں سے کام لے کر اس کو دُور کرے اور اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو دل سے۔ اور یہ آخری صورت ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے پس جس طرح آخری درجہ اضعف ایمان کا ہوا۔ اسی طرح پہلا درجہ کمالِ دعوت اور کمالِ ایمان کا ہوا اس سے بھی واضح تر حدیث ابن مسعودؓ کی ہے۔ مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ فِیْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَّقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ

مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ (مسلم) یعنی سُنّتِ الٰہی یہ ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیّت یافتہ یاروں کی ایک جماعت چھوڑ جاتا ہے یہ جماعت نبی کی سنت کو قائم رکھتی ہے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتی ہے یعنی شریعتِ الٰہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے۔ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیتے لیکن اس کے بعد شر و فتن کا دَور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو طریقۂ نبی سے ہٹ جاتے ہیں انکا فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے اور ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے شریعت نے حکم نہیں دیا سو ایسے لوگوں کے خلاف جس شخص نے قیامِ حق و سُنّت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا وہ مومن ہے اور جو ایسا نہ کر سکا مگر زبان سے کام لیا وہ بھی مومن ہے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکا اور دل کے اعتقاد اور نیّت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا وہ بھی مومن ہے لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں اس پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے حتّٰی کہ اب رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔

اس کام کی اہمیّت اور ضرورت کو امام غزالیؒ نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے:۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کا ایسا زبردست رُکن ہے جس سے دین کی تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ اس کو انجام دینے کے لیے حق تعالیٰ نے تمام انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرمایا اگر خدانخواستہ اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور اس کے علم و عمل کو ترک کر دیا جائے تو اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ نبوت کا بیکار ہونا لازم آئے گا۔ دیانت جو شرافتِ انسانی کا خاصّہ ہے، مضمحل اور افسردہ ہو جائے گی۔ کاہلی اور سستی عام ہو جائے گی۔ گمراہی اور ضلالت کی شاہراہیں کھُل جائیں گی۔ جہالت عالمگیر ہو جائے گی۔ تمام کاموں میں خرابی آ جائے گی، آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی، آبادیاں خراب ہو جائیں گی۔ مخلوق تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس تباہی اور بربادی کی اس وقت خبر ہو گی جب روزِ محشر کو خدائے بالا و برتر کے سامنے پیشی اور بازپرس ہو گی۔"

افسوس صد افسوس! جو خطرہ تھا وہ سامنے آ گیا، جو کھٹکا تھا آنکھوں نے دیکھ لیا۔ کَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۝ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ

رَاجِعُوْنَ ٥

اس سرسبز ستون کے علم و عمل کے نشانات مٹ چکے، اس کی حقیقت و رسوم کی برکتیں نیست و نابود ہو گئیں لوگوں کی تحقیر و تذلیل کا سکہ قلوب پر جم گیا۔ خدائے پاک کے ساتھ قلبی تعلق مٹ چکا اور نفسانی خواہشات کے اتباع میں جانوروں کی طرح بے باک ہو گئے۔ روئے زمین پر ایسے صادق مومن کا ملنا دشوار و کمیاب ہی نہیں بلکہ معدوم ہو گیا جو اظہارِ حق کی وجہ سے کسی کی ملامت گوارا کرے۔

اگر کوئی مردِ مومن اس تباہی اور بربادی کے ازالہ میں سعی کرے اور اس سنت کے احیاء میں کوشش کرے اور اس مبارک بوجھ کو لے کر کھڑا ہو اور آستینیں چڑھا کر اس سنت کے زندہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تو یقیناً وہ شخص تمام مخلوق میں ایک ممتاز اور نمایاں ہستی کا مالک ہو گا۔

امام غزالیؒ نے جن الفاظ میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا ہے وہ ہماری تنبیہ اور بیداری کے لیے کافی ہیں

ہمارے اس قدر اہم فریضہ سے غافل ہونے کی چند وجوہ معلوم ہوتی ہیں:۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس فریضہ کو علماء کے ساتھ خاص کر لیا۔ حالانکہ خطاباتِ قرآنی عام ہیں جو امتِ محمدیہ کے ہر ہر فرد کو شامل ہیں اور صحابہ کرام اور خیر القرون کی زندگی اس کے لیے شاہدِ عدل ہے:۔

فریضۂ تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو علماء کے ساتھ خاص کر لینا اور پھر ان کے بھروسہ پر اس اہم کام کو چھوڑ دینا ہماری سخت نادانی ہے۔ علماء کا کام راہِ حق بتلانا اور سیدھا راستہ دکھلانا ہے پھر اس کے موافق عمل کرانا اور مخلوقِ خدا کو اس پر چلانا یہ دوسرے لوگوں کا کام ہے اس کی جانب اس حدیث شریف میں تنبیہ کی گئی ہے۔

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْاَمِيْرُ الَّذِيْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ عَلَيْهِمْ وَهُوَ	بیشک تم سب کے سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے۔ پس بادشاہ لوگوں پر نگہبان ہے وہ اپنی رعیت

مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور مرد اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے، اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد پر نگہبان ہے وہ ان کے بارے میں سوال کی جاوے گی اور غلام اپنے مالک کے مال پر نگہبان ہے، وہ اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جاویگا پس تم سب نگہبان ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جاویگا۔

اور اسی کو واضح طور پر اس طرح بیان فرمایا ہے۔

قَالَ الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ (مسلم)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دین سراسر نصیحت ہے (صحابہؓ نے) عرض کیا کس کے لیے۔ فرمایا اللہ کے لیے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مسلمانوں کے مقتداؤں کے لیے اور عام مسلمانوں کیلیے

اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ یہ علماء کا کام ہے تب بھی اس وقت فضاء کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ہر شخص اس کام میں لگ جائے اور اعلاء کلمۃ اللہ اور حفاظت دین متین کے لیے کمر بستہ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ہم خود اپنے ایمان میں پختہ ہیں تو دوسروں کی گمراہی ہمارے لیے نقصان دہ نہیں جیساکہ اس آیت شریفہ کا مفہوم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ

اے ایمان والو! اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ

مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ط ہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں
(مائدہ - ع ۱۴) (بیان القرآن)

لیکن درحقیقت آیت سے یہ مقصود نہیں جو ظاہر میں سمجھا جا رہا ہے اس لیے کہ یہ معنی حکمتِ خداوندیہ اور تعلیماتِ شرعیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ شریعتِ اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتلایا ہے اور امتِ مسلمہ کو بمنزلہ ایک جسم کے قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بنی نوع انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور کمال کو پہنچ جائے اس میں ایسے لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے جو سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہوں تو آیت میں مومنوں کے لیے تسلی ہے کہ جب تم ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم ہو تو تم کو ان لوگوں سے مضرت کا اندیشہ نہیں جنہوں نے بھٹک کر سیدھا راستہ چھوڑ دیا۔

نیز اصل ہدایت یہ ہے کہ انسان شریعتِ محمدیہ کو مع تمام احکام کے قبول کرے اور منجملہ خداوندی احکام کے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ارشاد سے ہوتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِؓ قَالَ اَیُّهَا النَّاسُ اَنَّکُمْ تَقْرَؤُوْنَ هٰذِهِ الْاٰیَةَ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ط فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الْمُنْکَرَ فَلَمْ

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا۔ اے لوگو! تم یہ آیت یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ پیش کرتے ہو اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جب لوگ خلافِ شرع کسی چیز کو دیکھیں اور اس میں تغیّر نہ کریں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے عمومی عذاب میں

يُعَيِّرُوْهُ اَوْشَكَ اَنْ — مبتلا فرما دے۔
يَعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابِهٖ

علماء محققین نے بھی آیت کے یہی معنی لیے ہیں۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں :۔

"علماء محققین کا صحیح مذہب اس آیت کے معنی میں یہ ہے کہ جب تم اس چیز کو ادا کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تو تمہارے غیر کی کوتاہی تمہیں مضرت نہ پہنچائے گی جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور جب ایسا ہے تو منجملہ ان اشیاء کے جن کا حکم دیا گیا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے پس جب کسی شخص نے اس حکم کو پورا کر دیا اور مخاطب نے اس کی تعمیل نہ کی تو اب ناصح پر کوئی عتاب اور سرزنش نہیں، اس لیے کہ جو کچھ اس کے ذمہ واجب تھا وہ امر و نہی ہے اس نے اس کو ادا کر دیا۔ دوسرے کا قبول کرنا اس کے ذمے نہیں۔ واللہ اعلم"۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عوام و خواص، عالم و جاہل ہر شخص اصلاح سے مایوس ہو گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں کی ترقی اور انکا عروج ناممکن اور دشوار ہے جب کسی شخص کے سامنے کوئی اصلاحی نظام پیش کیا جاتا ہے تو جواب یہی ملتا ہے، کہ مسلمانوں کی ترقی اب کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ان کے پاس نہ سلطنت و حکومت ہے نہ مال و زر اور نہ سامانِ حرب اور نہ مرکزی حیثیت، نہ قوتِ بازو، اور نہ باہمی اتفاق و اتحاد۔

بالخصوص دیندار طبقہ تو بزعم خود یہ طے کر چکا ہے کہ اب چودھویں صدی ہے زمانہ رسالت کو بُعد ہو چکا۔ اب اسلام اور مسلمانوں کا انحطاط ایک لازمی شے ہے، پس اس کے لیے جدّوجہد کرنا عبث اور بیکار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جس قدر مشکوٰۃ نبوت سے بُعد ہوتا جائے گا حقیقی اسلام کی شعاعیں ماند پڑتی جائیں گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بقاء شریعت اور حفاظت دینِ محمدی کے لیے جدّوجہد اور سعی نہ کی جائے

اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا اور ہمارے اسلاف بھی خدانخواستہ یہی سمجھ لیتے تو آج ہم تک اس دین کے پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی البتہ جب کہ زمانہ ناموافق ہے تو رفتارِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے زیادہ ہمت اور استقلال کے ساتھ اس کام کو لیکر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ جو مذہب سراسر عمل اور جدّوجہد پر مبنی تھا۔ آج اس کے پیرو عمل سے یکسر خالی ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید اور حدیث شریف میں جگہ جگہ عمل اور جہد کا سبق پڑھایا اور بتلایا ہے کہ ایک عبادت گذار تمام رات نفل پڑھنے والا، دن بھر روزہ رکھنے والا، اللہ اللہ کرنے والا ہرگز اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جو دوسروں کی اصلاح اور ہدایت کی فکر میں بے چین ہو۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ جہادِ فی سبیل اللہ کی تاکید کی اور مجاہد کی فضیلت اور برتری کو نمایاں کیا۔

لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۙ دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (النساء ع ۱۳)

برابر نہیں وہ مسلمانوں جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کریں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بلند کیا ہے جو اپنے مال و جان سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر بیٹھنے والوں کے اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے اجرِ عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور مغفرت اور رحمت، اور اللہ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔

اگرچہ آیت میں جہاد سے مُراد کفّار کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا ہے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور کفر و شرک مغلوب و مقہور ہو لیکن اگر بد قسمتی سے آج ہم اس سعادتِ عظمٰے سے محروم ہیں تو اس مقصد کے لیے جس قدر جدّ و جہد ہماری مقدرت اور استطاعت میں ہے۔ اس میں تو ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔ پھر ہماری یہی معمولی حرکتِ عمل اور جدّو جہد ہمیں کشاں کشاں آگے بڑھائے گی وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ یعنی جو لوگ ہمارے دین کے لیے کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دینِ محمّدی کی بقا اور تحفظ کا حق تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، لیکن اس کے لیے ہمارا عمل اور سعی مطلوب ہے۔ صحابہ کرام نے اس کے لیے جس قدر انتھک کوشش کی اسی قدر ثمرات بھی مشاہدہ کیے اور غیبی نصرت سے سرفراز ہوئے، ہم بھی ان کے نام لیوا ہیں اگر اب بھی ہم ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اشاعتِ اسلام کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو یقیناً ہم بھی نصرتِ خداوندی اور امدادِ غیبی سے سرفراز ہوں گے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ یعنی اگر تم خدا کے دین کی مدد کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم خود ان باتوں کے پابند نہیں اور اس منصب کے اہل نہیں تو دوسروں کو کس مُنہ سے نصیحت کریں لیکن یہ نفس کا صریح دھوکہ ہے جب ایک کام کرنے کا ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے ہم اس کے مامور ہیں تو پھر ہمیں اس میں پس و پیش کی گنجائش نہیں۔ ہمیں خدا کا حکم سمجھ کر کام شروع کر دینا چاہیے۔ پھر انشاء اللہ یہی جدّ و جہد ہماری پختگی، استحکام اور استقامت کا باعث ہو گی اور اسی طرح کرتے کرتے ایک دن تقربِ خداوندی کی سعادت نصیب ہو جائے گی یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے کام میں جدّو جہد کریں اور وہ رحمٰن و رحیم ہماری طرف نظرِ کرم نہ فرمائے۔ میرے اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ رض قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا نَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ حَتّٰى نَعْمَلَ بِهٖ كُلِّهٖ وَلَا نَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰى نَجْتَنِبَهٗ كُلِّهٖ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَاِنْ لَّمْ تَعْمَلُوْا بِهٖ كُلِّهٖ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَاِنْ لَّمْ تَجْتَنِبُوْهُ كُلِّهٖ

(رواہ الطبرانی فی الصغیر الاوسط)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم بھلائیوں کا حکم نہ کریں جب تک خود تمام پر عمل نہ کریں اور برائیوں سے منع نہ کریں جب تک خود تمام برائیوں سے نہ بچیں حضور اقدس نے ارشاد فرمایا نہیں بلکہ تم بھلی باتوں کا حکم کرو اگرچہ تم خود ان سب کے پابند نہ ہو اور برائیوں سے منع کرو اگرچہ تم خود ان سب سے نہ بچ رہے ہو۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ ہم سمجھ رہتے ہیں کہ جگہ جگہ مدارس دینیہ کا قائم ہونا، علماء کا وعظ و نصیحت کرنا، خانقاہوں کا آباد ہونا، مذہبی کتابوں کا تصنیف ہونا۔ رسالوں کا جاری ہونا، یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شعبے ہیں اور ان کے ذریعہ اس فریضہ کی ادائیگی ہو رہی ہے اس میں شک نہیں کہ ان سب اداروں کا قیام اور بقا بہت ضروری ہے اور ان کی جانب اعتناء اہم امور سے ہے اس لیے کہ دین کی جو کچھ تھوڑی بہت جھلک دکھائی دے رہی ہے وہ انہی اداروں کے مبارک آثار ہیں لیکن پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری موجودہ ضرورت کے لیے یہ ادارے کافی نہیں اور ان پر اکتفاء کرنا ہماری کھلی غلطی ہے اس لیے کہ ان اداروں سے ہم اس وقت منتفع ہو سکتے ہیں جب ہم میں دین کا شوق اور طلب ہو اور مذہب کی وقعت اور عظمت ہو۔ اب سے پچاس سال پہلے ہم میں طلب اور شوق موجود تھا اور ایمانی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے ان اداروں کا قیام ہمارے لیے کافی تھا لیکن آج غیر اقوام کی انتھک کوششوں نے ہمارے اسلامی جذبات بالکل فنا کر دیئے اور طلب و رغبت کے بجائے آج ہم مذہب سے متنفر اور بیزار نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مستقل کوئی تحریک ایسی شروع کریں جس سے

عوام میں دین کے ساتھ تعلق اور شوق و رغبت پیدا ہو اور ان کے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہوں، پھر ہم ان اداروں سے ان کی شان کے مطابق منتفع ہو سکتے ہیں ورنہ اسی طرح اگر دین سے بے رغبتی اور بے اعتنائی بڑھتی گئی تو ان اداروں سے انتفاع تو درکنار ان کی بقا بھی دشوار نظر آتی ہے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ جب ہم اس کام کو لے کر دوسروں کے پاس جاتے ہیں تو وہ بری طرح پیش آتے ہیں اور سختی سے جواب دیتے ہیں اور ہماری توہین و تذلیل کرتے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کام انبیاء کرام کی نیابت ہے اور ان مصائب اور مشقتوں میں مبتلا ہونا اس کام کا خاصہ ہے اور یہ سب مصائب و تکالیف بلکہ اس سے بھی زائد انبیاء کرام نے اس راہ میں برداشت کیں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ○ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ حجر ع ۱	ہم بھیج چکے ہیں رسول تم سے پہلے اگلے لوگوں کے گروہوں میں اور ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا تھا، مگر یہ اس کی ہنسی اڑاتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے دعوت حق کی راہ میں جس قدر مجھ کو اذیت اور تکلیف میں مبتلا کیا گیا ہے، کسی نبی اور رسول کو نہیں کیا گیا۔

پس جب سردار دو عالم اور ہمارے آقا و مولیٰ نے ان مصائب اور مشقتوں کو تحمل اور بردباری کے ساتھ برداشت کیا تو ہم بھی ان کے پیرو ہیں اور انہی کا کام لے کر کھڑے ہوئے ہیں ہمیں بھی ان مصائب سے پریشان نہ ہونا چاہیے، اور تحمل اور بردباری کے ساتھ ان کو برداشت کرنا چاہیے۔

ماسبق سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ ہمارا اصل مرض روح اسلامی اور حقیقت ایمانی کا ضعف، اور اضمحلال ہے ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے اور ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی اور جب اصل شے میں انحطاط آ گیا تو اس کے ساتھ جتنی خوبیاں اور بھلائیاں وابستہ تھیں ان کا انحطاط پذیر ہونا بھی لابدی اور ضروری تھا

اس ضعف اور انحطاط کا سبب اس اصل شئے کا چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کی بقا اور دار و مدار ہے اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد خوبیوں اور کمالات سے آراستہ نہ ہوں۔

پس ہمارا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوّتِ ایمانی بڑھے اور اسلامی جذبات ابھریں۔ ہم خدا اور رسولؐ کو پہچانیں اور احکامِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوں اور اس کے لیے ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو سیّد الانبیاء و المرسلینؐ نے مشرکینِ عرب کی اصلاح کے لیے اختیار فرمایا:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط — بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ میں اچھی پیروی ہے۔

اسی کی جانب امام مالک رضی اللہ عنہ اشارہ فرماتے ہیں لَنْ يُّصْلِحَ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا مَا اَصْلَحَ اَوَّلَهَا یعنی اس امتِ محمدیہ کے آخر میں آنے والے لوگوں کی ہرگز اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس نے ابتدا میں اصلاح کی ہے۔

جس وقت نبیٔ کریمؐ دعوتِ حق لے کر کھڑے ہوئے، آپؐ تنہا تھے، کوئی آپؐ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا، کوئی دنیوی طاقت آپؐ کو حاصل نہ تھی، آپؐ کی قوم میں خودسری اور خود رائی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی، ان میں سے کوئی حق بات سُننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ بالخصوص جس کلمۂ حق کی آپؐ تبلیغ کرنے کھڑے ہوئے تھے اس سے تمام قوم کے قلوب متنفر اور بیزار تھے، ان حالات میں کون سی طاقت تھی جس سے ایک مفلس و نادار اور بے یار و مددگار انسان نے تمام قوم کو اپنی طرف کھینچا، اب غور کیجئے کہ وہ آخر کیا چیز تھی جس کی طرف آپؐ نے مخلوق کو بلایا اور جس شخص نے اس چیز کو پا لیا وہ پھر ہمیشہ کے لیے آپؐ کا ہو رہا، دُنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک سبق تھا، جو آپؐ کا مطمحِ نظر اور مقصودِ اصلی تھا جس کو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط (آل عمران ع ۷)

بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی دوسرے کو رب نہ قرار دے، خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے سوا ہر شے کی عبادت اور اطاعت اور فرمانبرداری کی ممانعت کی اور اغیار کے تمام بندھنوں اور علاقوں کو توڑ کر ایک نظام عمل مقرر کر دیا اور بتلا دیا کہ اس سے ہٹ کر کسی دوسری طرف رُخ نہ کرنا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط (اعراف ع ۱)

تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے آئی ہے، اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا اتّباع مت کرو۔

یہی وہ اصل تعلیم تھی جس کی اشاعت کا آپؐ کو حکم دیا گیا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (نحل ع ۱۶)

اے محمدؐ! بلاؤ لوگوں کو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت اور نیک نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کرو جس طرح بہتر ہو، بلاشبہ تمہارا ربّ ہی خوب جانتا ہے اس شخص کو جو گمراہ ہو اس کی راہ سے، وہی خوب جانتا ہے راہ چلنے والوں کو۔

اور یہی وہ شاہراہ تھی جو آپؐ اور آپؐ کے ہر پیرو کے لیے مقرّر کی گئی۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ ط وَسُبْحَانَ

کہہ دو یہ ہے میرا راستہ، بلاتا ہوں، اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر، میں اور جتنے میرے تابع ہیں وہ بھی، اور اللہ پاک ہے، اور

اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ	میں شریک کرنے والوں میں سے
الْمُشْرِكِيْنَ ٥ (یوسف ع ۱۲)	نہیں ہوں ۔
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ	اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے
دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا	جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل
وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ	کرے اور کہے میں فرمانبرداروں میں
(حم سجدہ ۔ ع ۴)	سے ہوں ۔

پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مخلوق کو بلانا، بھٹکے ہوؤں کو راہ حق دکھلانا، گمراہوں کو ہدایت کا راستہ دکھلانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وظیفۂ حیات اور آپؐ کا مقصدِ اصلی تھا اور اسی مقصد کی نشو و نما اور آبیاری کے لیے ہزاروں نبی اور رسول بھیجے گئے ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی
مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ	رسول مگر اس کی جانب یہی وحی بھیجتے
اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا	تھے کہ کوئی معبود نہیں بجز میرے ۔ پس
فَاعْبُدُوْنِ ٥ (الانبیاء ع ۲)	میری بندگی کرو ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور دیگر انبیاء کرامؑ کے مقدس لمحاتِ زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین صرف ایک ہے، اور وہ اللہ ربّ العالمین وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات و صفات کا یقین کرنا یہی ایمان اور اسلام کا مفہوم ہے اور اسی لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ٥ یعنی ہم نے جنّات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ بندہ بن کر زندگی بسر کریں ۔

اب جبکہ مقصدِ زندگی واضح ہو گیا اور اصل مرض اور اس کے معالجہ کی نوعیت معلوم ہو گئی تو طریقِ علاج کی تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی اور اس نظریہ کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاء اللہ نافع اور سود مند ہوگا ۔

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مُسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ